روشن مستقبل
مولانا وحید الدّین خاں

مولانا وحید الدّین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

مطبوعات اسلامی مرکز
جملہ حقوق محفوظ
ناشر: مکتبہ الرسالہ
سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ،
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: ۶۱۱۱۱۲۸
اشاعت اوّل ۱۹۹۱
مطبوعہ: نائس پرنٹنگ پریس، دہلی

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۔ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (البقرۃ ۲۴۹) کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی گروہ کا تعداد میں کم ہونا یا طاقت ور گروہ کی طرف سے زیادتیوں کا شکار ہونا اس کے لیے کوئی محرومی یا مایوسی کی بات نہیں۔ کیوں کہ اس دنیا کے خالق نے دنیا کے اندر جو مواقع رکھے ہیں وہ اس بات کو ممکن بناتے ہیں کہ کمزور گروہ خود طاقت ور گروہ پر غالب آجائے۔

ایسا کیونکر ہوتا ہے۔ اس کا راز، آیت کے مطابق، صبر ہے۔ جو لوگ صبر کے مراحل سے گزرتے ہیں، جو چیلنج سے دوچار ہوتے ہیں، جن کو زندہ رہنے کے لیے زیادہ محنت اور جوکسی کی ضرورت پیش آتی ہے وہ اس عمل کے دوران اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ زیادہ تعداد اور زیادہ قوت والے گروہ کو مغلوب کر کے ان کے اوپر فتح حاصل کرلیں۔

کسی انسان یا کسی انسانی گروہ کے لیے صبر کا مرحلہ پیش آنا ایسا ہی ہے جیسے پانی کا حرارت سے سابقہ پیش آنا۔ پانی کو جب گرمی پہنچائی جاتی ہے تو ۱۰۰ درجہ سنٹی گریڈ پر پہنچ کر وہ ابلنے لگتا ہے۔ اس کے مالیکیول ٹوٹ کر منتشر ہونے لگتے ہیں جس کو بھاپ کہا جاتا ہے۔ اس طرح حرارت پانی کے ذخیرہ کو پانی کے بجائے گیس میں تبدیل کر دیتی ہے۔ گیس کی صورت اختیار کرنے کے بعد پانی اتنا طاقتور ہو جاتا ہے کہ وہ بڑی بڑی مشینوں کو متحرک کر دیتا ہے۔ پانی گیس بننے کے بعد وہ کارنامہ انجام دیتا ہے جو عام پانی کبھی انجام نہیں دے سکتا تھا۔

اسی طرح جب کسی فرد یا گروہ کے ساتھ صبر آزما حالات پیش آئیں، اس کے وجود کو چیلنج کیا جانے لگے تو اس کی شخصیت میں ایک انفجار پیدا ہوتا ہے، اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھرنے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ "پانی" کے درجہ سے اٹھ کر "بھاپ" کے درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کسی گروہ کو صبر والے حالات سے سابقہ پیش آیا تو اس کے امکانات جاگ اٹھے۔ وہ ایک ناقابل تسخیر طاقت بن کر ابھر آیا۔ صبر نے اس کو معمولی انسان کے درجہ سے اٹھا کر غیر معمولی انسان بنا دیا۔ صبر نے اس کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے سے زیادہ اور اپنے سے طاقت ور لوگوں پر بھی غلبہ حاصل کرلے۔

خدا کی حفاظت میں

اسلام دینِ محفوظ ہے۔ مسلمان اس دینِ محفوظ کے حامل ہیں۔ مسلمانوں کی اس حیثیت نے ان کو بھی ایک محفوظ گروہ بنا دیا ہے۔ جس طرح اسلام کو مٹانا ممکن نہیں، اسی طرح مسلمانوں کو مٹانا بھی ممکن نہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے خدا کی یہ حفاظت جاری رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

مسلم امت کے ساتھ خدا کے اس معاملہ کا اظہار بار بار ہوا ہے۔ دور اول میں مکہ میں مسلمانوں کے قیام کو ناممکن بنا دیا گیا۔ عین اس وقت مدینہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے ایک طاقت ور مرکز فراہم کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب قبائل میں عمومی بغاوت پیدا ہوگئی جس کو تاریخ میں فتنۂ ارتداد کہا جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی مدد سے فتنہ کے پیدا ہوتے ہی اس کو کچل دیا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں رومی شہنشاہیت اور ایرانی شہنشاہیت نے مسلمانوں کو ختم کرنا چاہا مگر اللہ کی مدد سے مسلمان خود ان شہنشاہیتوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد یورپ کی مسیحی سلطنتوں نے متحدہ طور پر مسلم دنیا پر حملہ کر دیا تاکہ شام وفلسطین پر قبضہ کر لیں۔ مگر دوسو سالہ جنگ کے باوجود ان کو مکمل شکست ہوئی۔ آخری عباسی خلیفہ کے زمانہ میں تاتاری قبائل نے مسلم سلطنت کو تاراج کر دیا۔ سمرقند سے لے کر بغداد تک تمام مسجدوں کو ڈھا دیا۔ مگر صرف پچاس سال کے اندر تاریخ بدل گئی۔ تاتاریوں نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے ڈھائی ہوئی مساجد کو دوبارہ تعمیر کیا اور ان مسجدوں میں سجدہ کر کے خدا کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اقرار کیا۔

انیسویں صدی کے وسط میں مغل سلطنت ختم ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عثمانی خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ اب مسلمانوں کے لئے دنیا میں کوئی مستقبل نہیں۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ دنیا کے نقشہ پر پچاس سے زیادہ کی تعداد میں آزاد مسلم ممالک وجود میں آگئے ہیں اور تمام اسلامی سرگرمیاں از سر نو نئی قوت و وسعت کے ساتھ جاری ہو گئی ہیں۔

مسلمانوں کو امت مرحومہ کہا جاتا ہے، یہ بات صحیح نہیں۔ البتہ مسلمان امت محفوظ ہیں۔ یعنی ان کے اندر بگاڑ کے باوجود ان پر عذاب مستأصل نہیں آئے گا، اور کوئی قوم ان پر اتنا قابو نہ پاسکے گی کہ وہ ان کو بالکل مٹا دے۔ اس کا سبب کوئی فضیلت نہیں ہے۔ یہ دنیوی حفاظت مسلمانوں کو تمام تر ختم نبوت کے

طفیل میں حاصل ہوئی ہے۔

موجودہ زمانہ میں اس سنت الٰہی کا ظہور بہت بڑے پیمانہ پر ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اٹھے، انھوں نے اپنی غلط رہنمائی سے مسلمانوں کا یہ حال کر دیا کہ وہ اپنے اندر کسی بھی قسم کی بنیاد (base) فراہم نہ کر سکے۔ بے شمار ہنگامہ خیز تحریکیں صرف ان کی قوتوں کو ضائع کرتی رہیں۔ کوئی بھی تحریک انھیں وقت کی چیزوں میں سے کوئی چیز نہ دے سکی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے برتر انتظام کے تحت انھیں ہر چیز فراہم کر دی۔

لیڈروں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں مسلمان جدید اقتصادیات میں اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ قریب تھا کہ وہ زمانۂ جدید کے ہریجن بن کر رہ جائیں۔ مگر عین وقت پر تیل کا خزانہ ظاہر ہوا۔ مسلم ملکوں کی زمین کے نیچے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تیل کے ذخائر کا ۵۰ فی صد سے بھی زیادہ حصہ رکھ دیا۔ اس قدرتی خزانہ نے مسلمانوں کے اقتصادی پچھڑے پن کی تلافی کر دی۔

کائنات میں ایسے حقائق چھپے ہوئے تھے جو قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرنے والے تھے۔ مگر مسلم قائدین اپنے جھوٹے مشغلوں کی وجہ سے حقائق کائنات کی دریافت کے عمل میں نہ لگ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام مغربی قوموں سے لیا۔ انھوں نے حقائق فطرت کو دریافت کر کے اس بات کی علمی تفسیر فراہم کر دی کہ ہم ان کو آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ حق ہے (حم السجدہ)

اللہ تعالیٰ کو اس دین کی آواز سارے کرۂ ارض کے ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں پہنچانی تھی۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے عالم فطرت کے اندر وسائل اعلام کے نہایت اعلیٰ ذرائع چھپا رکھے تھے۔ مگر مسلم رہنما یہاں بھی ان چیزوں کو دریافت کرنے میں ناکام رہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری قوموں کو اس تحقیق پر لگا دیا۔ یہاں تک کہ وہ تمام اشاعتی ذرائع وجود میں آ گئے جن کو پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کہا جاتا ہے۔ ان ذرائع کے ظہور میں آنے کے بعد اب یہ نہایت آسان ہو گیا کہ ان کو استعمال کر کے اسلام کی آواز تمام کرۂ ارض میں پھیلا دی جائے۔

اس طرح کے بہت سے پہلو ہیں جو بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنی مدد سے مسلمانوں کی کوتاہیوں کی تلافی کی ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خدا کے اس معاملہ کو جانیں اور ان کو استعمال کرتے ہوئے اس خدمت اسلام میں لگ جائیں جس کے لئے ان کے رب نے ان کے ساتھ حفاظت و نصرت کا یہ خصوصی معاملہ فرمایا ہے۔

روشن مستقبل

مسلمان ایک ایسے پیغمبر کی امت ہیں جس کی بابت عالمی مؤرخین نے یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ پوری تاریخ کے سب سے زیادہ کامیاب (supremely successful) انسان تھے۔ قرآن کے مطابق، آپ دنیا میں اس لیے آئے تاکہ تمام انسانوں کے لیے بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) قائم کریں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ نہ صرف خود سب سے زیادہ کامیاب انسان تھے بلکہ آپ نے اپنی زندگی کے نمونہ سے سب سے بڑی کامیابی کا راز بتایا ہے۔ آپ نے خود کامیاب ہوکر کامیابی کا نمونہ قائم کیا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ترین مشکلیں پیش آئیں۔ آپ نے خود فرمایا کہ جتنا مجھے ستایا گیا اتنا کسی کو نہیں ستایا گیا۔ آپ نے ان مشکلوں اور ایذاؤں کے باوجود عظیم ترین کامیابی حاصل کی۔ ایک مستشرق نے بجا طور پر آپ کی بابت لکھا ہے کہ آپ کو اگرچہ مشکلات پیش آئیں، مگر آپ نے مشکلات کا مقابلہ اس عزم سے کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑ لیں:

He faced adversity with the determination
to wring success out of failure.

یہی وہ بات ہے جس کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ عسر کے ساتھ یُسر ہے (الانشراح) اس قرآنی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے نمونہ کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کے لیے کسی بھی حال میں مایوسی کی ضرورت نہیں۔ جب خود خالق کائنات نے یہ ابدی اعلان فرمادیا ہے کہ اس دنیا میں عسر (مشکل) کے ساتھ یُسر (آسانی) ہے۔ بالفاظ دیگر، یہاں ہر ڈِس ایڈوانٹج کے ساتھ ایڈوانٹج بھی لازمی طور پر موجود رہتا ہے تو ایسی حالت میں ہم کو اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔

قرآن کی اس خبر کی صحت کو پیغمبر اسلام نے اس اعلیٰ درجہ پر ثابت کیا کہ آپ نے ناکامی سے کامیابی کو نچوڑ لیا اور ہر قسم کی مشکلوں کے باوجود تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ ایسی حالت میں مسلمان کو ہمیشہ پُرامید رہنا چاہیے، اس کو کسی بھی حال میں مایوسی کو اپنے دل میں جگہ نہیں دینا چاہیے۔

مسلمان ایک روشن مستقبل کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں ——— ان کا پیغمبر ان کو ابدی طور پر یہ پیغام دے رہا ہے۔

ہندستان میں

۱۹۶۷ میں راقم الحروف کی ادارت میں، الجمعیۃ ویکلی نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کے پہلے شمارہ یکم ستمبر ۱۹۶۷ء کے اداریہ میں میں نے لکھا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے اندر حقیقت پسندانہ نقطہ نظر (realistic approach) پیدا کیا جائے۔

راقم الحروف کا خیال تھا اور ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے ہر قسم کی ترقی کے مواقع پوری طرح موجود ہیں۔ یہاں مکمل طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ وہ باعزت اور خوش حال اور ترقی یافتہ گروہ بن کر رہ سکیں۔ مگر صرف ایک چیز کی کمی نے یہاں ان کے لیے غیر ضروری قسم کے مسائل پیدا کر رکھے ہیں، اور یہ کمی حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کی ہے۔ مسلمانوں کے اندر اگر حقیقت پسندی آجائے تو کوئی بھی چیز ان کی ترقی کو روکنے والی نہیں بن سکتی۔

"۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰" کو پیش آنے والے حالات نے ملک میں جو نیا رخ اختیار کیا ہے، وہ بظاہر تشویشناک ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ یہ عَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرہ ۲۱۶) کا مصداق ہے۔ اس بظاہر ناپسندیدہ صورت حال میں ان کے لیے عظیم خیر چھپا ہوا ہے۔

وہ خیر کیا ہے۔ وہ خیر یہی حقیقت پسندی ہے۔ موجودہ دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا راز حقیقت پسندانہ مزاج ہے۔ آدمی کی فطرت خود بخود اس کو حقیقت پسندی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر اپنی سطحی اور جذباتی باتوں سے مسلمانوں کو بہکائے ہوئے تھے۔ اب حالات نے ان نااہل لیڈروں کی نااہلی کو دو اور دو چار کی طرح ثابت کر دیا ہے۔ قوی امید ہے کہ اب مسلمان ان لیڈروں کو چھوڑ دیں گے۔ اب وہ فطرت اور قرآن اور اسوۂ رسول کی روشنی میں اپنی راہ عمل بنائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے سب سے زیادہ حقیقت پسند انسان تھے۔ اسی لیے آپ نے تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ موجودہ حالات اب مسلمانوں کو ایسے مقام پر لے آئے ہیں جہاں وہ خود بخود حقیقت پسند بن جائیں گے۔ اور ان کی زندگی کا یہ نیا موڑ بلاشبہ ان کی کامیابی اور ترقی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

زمین و آسمان کا پورا نظام حقائق کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ انسان بھی اس دنیا میں حقائق کی رعایت کر کے کامیاب ہو سکتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں نے اب اس راز کو پالیا ہے۔ اور اس راز کو پالینے ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

قدرت کا پیغام

مسلمانوں سے میں قدرت کی زبان میں کہوں گا کہ زمین و آسمان کے اشاروں کو سمجھو، اور کائنات میں نشر ہونے والے پیغام کو سنو۔ کیوں کہ یہ دنیا ہر آن تمہارے لیے امید کی خبریں نشر کر رہی ہے۔

یاد رکھو، تاریک رات کا آنا روشن صبح کے آنے کی تمہید ہے۔ خزاں کا موسم یہ خبر دیتا ہے کہ جلد ہی بہار کا موسم آنے والا ہے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ یہ قانون جس طرح مادی دنیا کے لیے ہے اسی طرح وہ انسانی دنیا کے لیے ہے، اور یقینی طور پر خود تمہارے لیے بھی۔

بظاہر اس وقت مسلمانوں کو صبر آزما حالات کا سامنا ہے۔ مگر یہ حالات عین خدا کی رحمت ہیں۔ یہ مسلمانوں کے مس خام کو کندن بنانے کا خدائی انتظام ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ صبر مومن کا ہتھیار ہے (الصبر معول المومن) صبر ایک قسم کا تربیتی کورس ہے جو آدمی کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ صبر آدمی کے اندر پختگی کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ صبر آدمی کو بلند انسانی اوصاف کا حامل بناتا ہے۔ صبر آدمی کو یہ طاقت دیتا ہے کہ وہ اعلیٰ اسلامی اخلاقیات پر قائم ہو سکے۔ صبر آدمی کو معمولی انسان کے درجہ سے اٹھا کر غیر معمولی انسان کے درجہ میں پہنچا دیتا ہے۔ صبر کسی فرد یا قوم کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔

صبر مایوسی کی بات نہیں، صبر خوش خبری کا لمحہ ہے۔ صبر اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی مدد قریب آگئی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، اللہ صبر کا ثبوت دینے والوں کو دنیا کا امام بنا دیتا ہے۔

صبر کی طاقت

حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کے درمیانی زمانہ میں بنی اسرائیل کے یہاں جنگ کا ایک واقعہ ہوا۔ اس وقت بنی اسرائیل کے جوانوں کی تعداد کم تھی اور دشمن کی فوج تعداد اور اسباب میں بہت زیادہ تھی۔ اس فرق کو دیکھ کر بنی اسرائیل کے لوگ ڈر گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو دشمن سے لڑنے کی طاقت نہیں (البقرہ ۲۴۹)

بائبل کے بیان کے مطابق، اس وقت بنی اسرائیل کے سردار (یونتن) نے اپنے ساتھی سے کہا کہ آ ہم اُدھر ان نامختونوں کی چوکی کو چلیں۔ ممکن ہے کہ خداوند ہمارا کام بنا دے۔ کیوں کہ خداوند کے لئے بہتوں یا تھوڑوں کے ذریعہ سے بچانے کی قید نہیں (۱۔ سموئیل ۱۴ : ۶) یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

قال الذین یظنون انہم ملاقو اللہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللہ مع الصابرین (البقرۃ ۲۴۹)	جو لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں، انھوں نے کہا کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت میں قلیل اور کثیر کا لفظ صرف عددی معنوں میں اقلیت اور اکثریت کے لئے نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ وہ کمزور اور طاقت ور کے معنی میں بھی ہے۔ عربی زبان میں قلیل اور کثیر کا لفظ اس توسیعی مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جاہلی دور کے عرب شاعر کا یہ شعر اس کی ایک مثال ہے:

فان الف فی شرارکم قلیل فانی فی خیارکم کثیر

قرآن کی اس آیت میں دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ کسی گروہ کا قلیل التعداد یا کمزور ہونا اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ کثیر التعداد یا طاقت ور فریق کے مقابلہ میں ہمیشہ ناکام رہے۔ اس دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں کمزور بھی طاقت ور پر غالب آسکتا ہے۔ یہاں اقلیت بھی اکثریت کو مفتوح کر سکتی ہے۔

اس فتح و کامرانی کا راز آیت میں صبر بتایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کوئی

انفعالی کیفیت یا بزدلی کی چیز نہیں۔ صبر ایک فعال صفت ہے۔ وہ ایک بہادرانہ خصوصیت ہے۔ صبر اتنی عظیم چیز ہے کہ جو لوگ اس کا ثبوت دیں وہ خدا کی خصوصی نصرت کے مستحق بن جاتے ہیں۔ حتی کہ اس کا نتیجہ اس صورت میں نکلتا ہے کہ ایک بظاہر کمزور گروہ ایک بظاہر طاقتور گروہ کے اوپر غلبہ حاصل کر لیتا ہے

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان ہمیشہ مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اس مقابلہ میں کبھی ایک گروہ غالب آجاتا ہے اور دوسرا گروہ اس کے مقابلہ میں بظاہر مغلوب اور کمزور ہو کر رہ جاتا ہے۔

جب کوئی گروہ دوسرے کے مقابلہ میں کمزور پڑ جائے اور اس کو نقصان اٹھانا پڑے تو اس کے بعد کمزور گروہ کے ردعمل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک غیر صابرانہ ردعمل، دوسرا صابرانہ ردعمل۔

غیر صابرانہ ردعمل یہ ہے کہ آدمی مایوسی اور احساس شکست کا شکار ہو کر رہ جائے۔ وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ جائے۔ وہ سمجھ لے کہ اب میرے لئے یہاں کچھ نہیں ہے۔ وہ دوسرے گروہ کو اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف فریاد اور احتجاج کرنے لگے۔ یہ تباہی کی صورت ہے۔ دوسروں نے اگر اس کو ابتدائی نقصان پہنچایا تھا تو اس کے بعد وہ خود اپنے آپ کو نقصان پہنچا کر اپنی تباہی کی تکمیل کر لیتا ہے۔

دوسرا ردعمل صابرانہ ردعمل ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو چوٹ لگنے کے بعد اپنے آپ کو سنبھالتا ہے۔ اس کا ذہن شکایت کرنے کے بجائے تدبیر کے رخ پر چلنے لگتا ہے۔ وہ مایوسی میں پڑنے کے بجائے امید کے پہلوؤں پر غور کرتا ہے۔ وہ کھوئے ہوئے کا غم کرنے کے بجائے یہ چاہتا ہے کہ ملے ہوئے کو استعمال کرے۔

جو لوگ زک اٹھانے کے بعد اس طرح صبر کے طریقہ کو اختیار کریں وہ گویا اپنے آپ کو حالات سے اوپر اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس حالت کی طرف لے جاتے ہیں جہاں ان کے اندر چھپے ہوئے امکانات جاگیں۔ ان کی شخصیت مزید طاقت کے ساتھ ابھر آئے۔

غیر صابر آدمی نقصان کو نقصان کے روپ میں دیکھتا ہے۔ صابر آدمی نقصان کو اپنے لئے چیلنج سمجھتا ہے۔ وہ حالات کا مقابلہ کر کے اپنے آپ کو آگے لے جانا چاہتا ہے۔ اور جو لوگ نقصان کا اس

طرح استقبال کریں، وہ ہمیشہ آگے بڑھتے ہیں۔ وہ اپنی ناکامی کو دوبارہ عظیم تر کامیابی میں تبدیل کر لیتے ہیں۔

جب ایسا ہو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے اوپر ظلم کرے، اور مظلوم گروہ بھی اس کے جواب میں ظالمانہ کارروائی کرنے لگے تو دونوں گروہ اخلاقی اعتبار سے برابر ہو گئے۔ ایسے دونوں گروہوں کو اللہ ان کی اپنی ذات کے حوالے کر دیتا ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی اللہ کی مدد حاصل نہیں ہوتی۔

لیکن اگر ایسا ہو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کو اپنے ظلم اور سرکشی کا نشانہ بنائے۔ مگر مظلوم گروہ جوابی کارروائی کرنے کے بجائے اس پر صبر کر لے، تو خدا صابر گروہ کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ مظلوم گروہ کی مدد کرکے اس کو ظالم گروہ کے اوپر فاتح بنا دیتا ہے۔

مظلوم گروہ کو یہ فائدہ تمام تر صبر کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ صبر کوئی بے عملی کی حالت نہیں، صبر سب سے بڑا عمل ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر اٹھتے ہوئے جذبات کو منفی رخ سے ہٹا کر مثبت رخ کی طرف پھیر دے۔

صبر کی صفت اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہے۔ جو شخص صبر کرے وہ بے پناہ شخصیت کا مالک بن جاتا ہے۔ تمام قوانین فطرت اس کے حق میں متحرک ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد کے تحت وہ ایک ناقابل تسخیر ہستی بن جاتا ہے۔

صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھائے۔ وہ ظالم کی بدخواہی کے جواب میں اس کے ساتھ خیر خواہی کرنا سکھاتا ہے۔ وہ برے عمل کا جواب بھلے عمل سے دینے کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ صابر آدمی ظالم کے ظلم پر اس کے خلاف بد دعا نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کی ہدایت کی دعا مانگتا ہے۔

صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ایسا نہ کرے کہ وہ اشتعال انگیزی کے وقت مشتعل ہو جائے اور عاجلانہ کارروائی میں اپنی طاقت کو ضائع کرے۔ صبر آدمی کو بے پناہ حد تک طاقتور بنا دیتا ہے۔ وہ آدمی کی خفیہ صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ وہ آدمی کے چھپے ہوئے امکانات کو بیدار کرتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر منصوبہ بند کام کرنے کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ صبر آدمی کو معمولی انسان کے درجہ سے اٹھا کر غیر معمولی انسان کے درجہ میں پہنچا دیتا ہے۔

فتح باب

۱۲ نومبر ۱۹۹۰ کا واقعہ ہے۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ کچھ ہندو بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک مسلمان ان سے اسلام کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ ہندوؤں کا کہنا تھا کہ تمہارا مذہب مار کاٹ کا مذہب ہے۔ مسلمان نے پوچھا کہ کیسے تم ایسا کہتے ہو۔ ہندو نے کہا کہ تم لوگ صبح ہی صبح اٹھ کر اپنی مسجدوں سے اللہ اکبر، اللہ اکبر کی پکار بلند کرتے ہو۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ اللہ کے نام پر کافروں کو مارو۔ اللہ کے لیے لوگوں کو قتل کرو۔

مسلمان نے کہا کہ یہ آپ بالکل الٹی بات کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ اللہ اکبر کہنے کے بعد مسلمان اپنی مسجدوں میں کیا کرتے ہیں۔ مسلمان اس کے بعد وہ کام کرتے ہیں جس کو رکوع اور سجدہ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ جھکتے ہیں اور اپنا سر زمین پر رکھ دیتے ہیں۔ پھر جب وہ نماز ختم کرتے ہیں تو کہتے ہیں: السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یعنی تمام لوگوں پر سلامتی اور رحمت ہو۔

یہ مسلمان بظاہر کوئی عالم نہ تھا۔ اور نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہے۔ یہ بات اس نے فطرت کے زور پر کہی نہ کہ علم کے زور پر۔ یہ بات دراصل "معلم فطرت" نے اس کو بتائی تھی۔ جھوٹے رہنما جہاں گمراہ کرنے کے لیے موجود نہ ہوں، وہاں فطرت خداوندی انسان کی رہنما بن جاتی ہے۔ اور بلاشبہ فطرت خداوندی سے زیادہ بہتر کوئی معلم انسان کے لیے نہیں۔

میں نے مسلمان کی مذکورہ باتیں سنیں تو ایسا محسوس ہوا گویا میں اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آگیا ہوں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ موجودہ حالات نے ملت اسلام کے لیے تاریخ کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ موجودہ حالات خود اپنی اندرونی منطق کے تحت مسلمانوں کو اسلام کا سچا مبلغ بنا رہے ہیں۔ یہ حالات خود بخود مسلمانوں کو بتا رہے ہیں کہ وہ اس اسلام کو لوگوں کے سامنے پیش کریں جو سچا اسلام ہے اور اسی کے ساتھ وہ موجودہ حالات میں ان کے لیے ایک ڈھال کا کام کرتا ہے۔

یعنی وہ اسلام جو دین فطرت ہے۔ جو انسان کے روحانی تقاضوں کا جواب ہے۔ جس میں محبت اور تواضع کی تعلیم ہے۔ جس کے اندر امن اور رحمت کا پیغام ہے۔ جو انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے ساتھ دنیا میں زندگی گزارے۔ وہ سورج کی طرح دنیا میں رہے جو ہر ایک کو اپنی روشنی پہنچاتا ہے، وہ پھول کی طرح معاملہ کرے جو اپنے دشمن کو بھی رنگ اور خوشبو کا تحفہ دیتا ہے۔

موجودہ صدی کے نصف اول تک دنیا میں مغربی استعمار کا دور تھا۔ اس زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے لڑائی کا راستہ اختیار کیا۔ ان کو جنگ وجدال والا اسلام اپنے حق میں زیادہ مفید نظر آیا۔ چنانچہ ہندستان میں اور ساری دنیا میں ایک خود ساختہ اسلام کی دھوم مچا دی گئی۔ حتیٰ کہ یہی اسلام لوگوں کی نظر میں اصل اسلام بن گیا۔ اس زمانہ کے تمام مسلم رہنما ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو کر قولی یا عملی لڑائی میں مشغول ہو گئے۔ یہی زمانہ ہے جبکہ اقبال نے کہا:

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں　　　خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

اس زمانہ میں مسلم اداروں نے تلوار کو اپنا شعار بنایا۔ ابوالکلام آزاد نے امام حسینؓ کو شہید اعظم اور تاریخ کا سب سے بڑا ہیرو بنا کر پیش کیا۔ ابوالاعلیٰ مودودی نے الجہاد فی الاسلام لکھی۔ وغیرہ۔ اس قسم کی تحریروں اور تقریروں نے اسلام کو لوگوں کی نظر میں جنگ اور ٹکراؤ کا مذہب بنا دیا۔ مسلمان اس بات کو بھول گئے کہ ان کے رسولؐ کو خدا نے ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا تھا۔ اور اسلام کے جس سبق کو مسلمان بھلا دیں، اس کو غیر مسلم بدرجۂ اولیٰ فراموش کر دیں گے۔

مگر اب نئے حالات کا دباؤ اس غلط ذہن کی تصحیح کر رہا ہے۔ اب مسلمان عین حالات کے تقاضے کے تحت، اس اسلام کی طرف لوٹ رہے ہیں جو اصلی اور حقیقی اسلام ہے۔ اب نہ صرف یہ ہوگا کہ مسلمان اسلام کی صبر و اعراض اور نصح و امانت والی تعلیمات کی اہمیت کو از سر نو دریافت کریں گے، بلکہ خود اپنی فکری مدافعت کے لیے اس کو ضروری سمجھیں گے کہ اسلام کے رحمت والے پیغام کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کریں۔ تاکہ دوسروں کی نظر میں ان کی صحیح تصویر بنے۔ دوسروں کی نظر میں ان کا وقار پیدا ہو۔ وہ عزت اور امن کے ساتھ اس ملک میں رہ سکیں۔ وہ ایسے دین کے حامل قرار پائیں جو آدمی کو لوگوں کی نظر میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے۔

اب تک مسلمانوں کے لیڈر انھیں خود ساختہ اسلام کا نمائندہ بنائے ہوئے تھے۔ اب نئے حالات انھیں اس طرف لے جا رہے ہیں کہ وہ خدا کے سچے دین کے نمائندہ بنیں یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے مستقبل کی تعمیر ہے۔ وہ اسلامی دعوت کے لیے فتح باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان حالات پر جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے تاریخ دوبارہ وہاں جاتی ہوئی نظر آتی ہے جہاں وہ تاتاری حملہ کے بعد عالم اسلام میں پہنچی تھی۔ عباسی دور میں مسلمانوں کے درمیان اسلام کا جو ڈھانچہ موجود تھا، وہ ایک ایسا ڈھانچہ تھا جس میں انسان کے لیے بہت کم کشش باقی رہ گئی تھی۔ اسلام کا توسیعی سیلاب رک گیا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس مصنوعی ڈھانچہ کو توڑ دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان وہ اسلام آگیا جو سچا

اسلام تھا، جو انسانی فطرت کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام دوبارہ سیلاب کی طرح پھیلنے لگا۔ قومیں کی قومیں اسلام میں داخل ہوگئیں۔ نئے خون کی اس آمیزش کے بعد مسلمانوں نے دوبارہ اسلام کی ایک طاقت ور تاریخ بنائی جو صدیوں تک جاری رہی۔

عباسی دور کے اسلام کی ایک فکری مثال لیجیے۔ ہماری موجودہ فقہ زیادہ تر اسی عباسی دور میں بنی ہے۔ عباسی دور مسلمانوں کے لیے فتح و غلبہ کا دور تھا۔ اس کے زیر اثر مسلمانوں میں حاکمانہ نفسیات پیدا ہوگئی۔ مسلمان اپنے آپ کو "داعی" کے بجائے "فاتح" سمجھنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ میں کئی ایسے مسائل داخل ہوگئے جو محض اس وقت کے سیاسی حالات کا نتیجہ تھے نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی تعلیم کا نتیجہ۔

مثلاً ہمارے فقہاء نے پوری دنیا کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک حصہ کو انھوں نے دار الاسلام کہا اور دوسرے حصہ کو دار الحرب۔ یہ تقسیم یقینی طور پر زمانی حالات کا نتیجہ تھی۔ یہ فقہ اگر عہد نبوت میں بنتی جبکہ ایک طرف دعوت الی اللہ کا کام جاری تھا۔ دوسری طرف مدینہ میں اسلام کا با اختیار مرکز قائم ہو رہا تھا، تیسری طرف جارح اور حملہ آور قبائل سے اسلام کی دفاعی جنگ ہو رہی تھی۔ تو نقشہ مختلف ہوتا۔

ان حالات میں فقہاء اگر عالم انسانی کی تقسیم کرتے تو وہ اس کو دو کے بجائے تین حصوں میں بانٹتے ـــــ دار الدعوۃ، دار الاسلام، دار الحرب (دار الحرب فقہاء کے معروف معنی میں نہیں، بلکہ اس معنی میں کہ وہ ملک جس سے جارحیت کی بنا پر مسلمانوں کو دفاعی جنگ لڑنی پڑے اور اس طرح مسلمان ان سے برسر جنگ ہو گئے ہوں) مگر زمانی حالات کی بنا پر فقہاء کی تقسیم میں دار الدعوۃ حذف ہوگیا، حالانکہ وہ اسلام کا اہم ترین حصہ تھا۔

حقیقی اسلام جس کا نمونہ رسولؐ اور اصحاب رسول نے قائم کیا ہے، اس کے مطابق مسلمانوں کا مزاج بنے تو وہ یہ ہوگا کہ مسلمان دنیا کی قوموں کو اسلام کے پیغام رحمت کا مخاطب بنائیں۔ جہاں مسلمانوں کو فیصلہ کن اکثریت حاصل ہو وہاں کی عملی زندگی کا نقشہ اسلامی احکام کی بنیاد پر قائم کریں۔ اور اگر کوئی قوم ان کے خلاف جارحیت کرے تو اس سے مقابلہ کر کے اسلام کا دفاع کریں۔ مگر مذکورہ فقہی تقسیم میں دعوت کا پہلو سرے سے حذف ہوگیا۔ اس میں صرف دوسرا اور تیسرا پہلو باقی رہا، اور وہ بھی ناتمام صورت میں۔

فقہاء کی تقسیم کے مطابق، اُس وقت کے مسلمانوں میں جو ذہن بنا وہ حاکمانہ ذہن تھا نہ کہ داعیانہ

ذہن۔ دار الاسلام اور دار الحرب کی عالمی تقسیم کے بعد عملی طور پر مسلمانوں کے اندر یہی فکر ابھر سکتا تھا اور یہی فکر ابھرا کہ مسلمان کے لیے کرنے کا کام صرف دو ہے ـــــــ حاصل شدہ حصۂ زمین پر حکومت کرنا۔ اور زمین کا جو حصہ ابھی حاصل نہیں ہوا اس کو لڑ کر اپنے قبضہ میں لانا تاکہ اس پر حکومت کی جا سکے۔

مسلمانوں کا یہی غیر صحیح ذہن تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے تاتاری قبائل کو مدعو سمجھنے کے بجائے انھیں اپنا حریف سمجھا۔ چنگیز خاں کے وفد کا احترام کرنے کے بجائے انھوں نے ان کی تحقیر کی۔ خوارزم شاہ کے حکم کے تحت تاتاری وفد کے اموال چھین لیے گئے اور انھیں قتل کر دیا گیا (البدایہ والنہایہ ۱۳/۸۳)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور تاتاریوں کے درمیان داعی۔ مدعو کا رشتہ قائم نہ ہو سکا۔ اس کے بجائے ان کے درمیان حریف اور دشمن کا رشتہ قائم ہو گیا۔ چنگیز خاں کے دل میں ابتداءً مسلمانوں کے لیے نرم گوشہ تھا۔ مگر مذکورہ واقعہ کے بعد اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف غصہ اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ تاتاری لشکر اپنی تمام وحشت و بربریت کے ساتھ عالم اسلام پر ٹوٹ پڑا۔ ان کا غصہ صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ انھوں نے عالم اسلام کو اپنے قدموں کے نیچے پامال کر دیا۔

اس دور میں جو عملی خرابی پیدا ہوئی، اس کو میں ایک مثال کے ذریعہ واضح کروں گا۔ ساتویں صدی ہجری میں تاتاری جب عباسی خلافت کو زیر و زبر کر چکے اور نتیجۃً تاتاری احساسِ غلبہ اور مسلمان احساسِ مغلوبیت سے دوچار ہو گئے، اس زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک تاتاری نوجوان تغلق تیمور ایرانی علاقہ میں شکار کھیل رہا تھا۔ اس کی ملاقات ایک ایرانی مسلمان سے ہوئی۔

تاتاری نوجوان گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے احساسِ برتری کے تحت اپنے کتے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ تم مسلمانوں سے تو میرا یہ کتا اچھا ہے۔ اگر یہ مسلمانوں کے غلبہ اور حکمرانی کا دور ہوتا تو مذکورہ مسلمان اس بات کو سن کر فوراً اپنی تلوار نکالتا اور تاتاری نوجوان کی گردن مار کر کہتا کہ اب بتاؤ میں اچھا ہوں یا تمہارا کتا اچھا ہے۔

مگر اس وقت مسلمان احساس مغلوبیت سے دوچار تھے۔ حالات نے انھیں شکستگی کے مقام پر پہنچا دیا تھا۔ ان کے دلوں میں کبر اور سرکشی کے بجائے تواضع اور دردمندی کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ تاتاری نوجوان کا جملہ سن کر مسلمان کی زبان سے نکلا: "اگر ہم کو سچا دین نہ ملتا تو یقیناً ہم کتے سے زیادہ برے ہوتے"۔ مسلمان کے اس پرسوز جملہ نے تاتاری نوجوان کو تڑپا دیا۔ اس کے بعد وہ سچے دین کی تحقیق میں لگ گیا۔

یہاں تک کہ آخر کار اس نے اسلام قبول کر لیا (ایمانی طاقت ۲۶ ـ ۲۷)

مسلمانوں پر جو مصیبت آتی ہے، وہ قرآن کے مطابق، مصیبت نہیں ہوتی بلکہ آزمائش ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں کو پاک کرے اور ان کی فکر کی تصحیح کرے (آل عمران ۱۵۴) موجودہ حالات مجھے ٹھیک اسی نوعیت کے نظر آرہے ہیں۔

عباسی دور کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تاتاریوں کے ذریعہ جھنجھوڑا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی حاکمانہ فکر دوبارہ دعوتی فکر میں تبدیل ہوئی۔ ان کا احساس برتری ٹوٹا اور اس کی جگہ تواضع، پرسوزی اور حقیقت پسندی کا احساس ابھر آیا۔ ان چیزوں نے مسلمانوں میں دوبارہ وہ اوصاف پیدا کیے جو داعی کے اوصاف ہوتے ہیں۔ وہ تاتاریوں کے درمیان اس سیدھے اور سچے اسلام کے نمائندہ بن گئے جو انسان کو خود بخود اپنی طرف کھینچتا ہے۔

اس طرح مسلم دنیا میں ایک نیا عمل جاری ہوا جس کو دعوتی عمل کہا جاسکتا ہے۔ اس نے تاتاریوں کے دلوں کو مسخر کرنا شروع کر دیا۔ تاتاری قبائل اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ پچاس سال کے اندر بیشتر تاتاریوں نے اور خود ان کے شاہی خاندان نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ لوگ جو اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا نعرہ لے کر اٹھے تھے، وہ اسلام کے خادم اور سپاہی بن گئے۔

حالات بتاتے ہیں کہ یہی تاریخ دوبارہ دہرائی جانے والی ہے۔ اور یہ سب کچھ خود اللہ کی طرف سے کیا جا رہا ہے، اور اللہ بلاشبہہ سب سے بڑا کارساز ہے۔

تاریخ کا سبق

۶ نومبر ۱۹۹۰ کو نئی دہلی میں کارسیوکوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہوئی۔ اس موقع پر اگرچہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر لال کرشن اڈوانی شریک نہ ہو سکے۔ تاہم دوسرے کئی ہندو لیڈروں نے پرجوش تقریریں کیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۸ نومبر ۱۹۹۰) نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری مسٹر اشوک سنگھل نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو وارننگ دی کہ وہ اجودھیا مندر بنانے کی مخالفت نہ کریں۔ ورنہ ان کی پارٹی ملک میں اسی قسم کی تین ہزار متنازعہ جگہوں پر مندر بنانے کی تحریک شروع کر دے گی:

The Vishwa Hindu Parishad general secretary, Mr Ashok Singhal, warned Muslims not to oppose the Ayodhya temple's construction. Otherwise, he said, his party would start an agitation for building temples at 3,000 similarly disputed sites all over the country.

اس قسم کے الفاظ مسلمانوں کے خلاف چیلنج نہیں ہیں، وہ خود خدا کے خلاف چیلنج ہیں۔ کیوں کہ مسجد خدا کا گھر ہے، اس بنا پر وہ خدا کا معاملہ ہے۔ جو لوگ اس قسم کا چیلنج دیں، وہ گویا براہ راست خدا سے لڑنا چاہتے ہیں۔ اور کون ہے جو خدا سے لڑ کر کامیاب ہو۔

یمن کے حاکم ابرھہ نے ۵۷۰ء میں اسی قسم کا چیلنج دیا تھا جب کہ وہ ۶۰ ہزار کا لشکر اور ایک درجن ہاتھی لے کر مکہ روانہ ہوا تاکہ کعبہ کو ڈھادے۔ مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ "چڑیوں کا جھنڈ" خدائی فوج کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس نے پتھروں کی بارش سے پورے لشکر کو بھس بنا دیا۔

یہی واقعہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کو دوبارہ اجودھیا میں پیش آیا ہے۔ ہندو انتہا پسند جماعتوں نے اعلان کیا تھا کہ اس تاریخ کو لاکھوں ہندو اجودھیا پہنچیں گے اور وہ بابری مسجد کو ڈھا کر اس کی جگہ رام مندر تعمیر کریں گے۔ مگر، جیسا کہ معلوم ہے، ہندستان کی مرکزی حکومت اور یوپی کی ریاستی حکومت اس کے خلاف اپنی پوری طاقت کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ مذکورہ تاریخ کو اجودھیا جانے کے تمام راستے بند کر دیے گئے۔ ہوائی جہاز گراؤنڈ کر دیے گئے۔ ریلیں اور بسیں روک دی گئیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ فوج اور پولیس اجودھیا میں اور اس کے آس پاس کھڑی کر دی گئی۔ اس پوری مہم میں حکومت نے جو خرچ کیا اور اس کا جو نقصان ہوا، اس کی مقدار تقریباً چالیس کروڑ روپیہ بتائی جاتی ہے۔

انڈیا ٹوڈے (۱۵ نومبر ۱۹۹۰) نے اپنی باتصویر مفصل رپورٹ میں بتایا ہے کہ اس موقع پر بہار اور یوپی میں تقریباً دو لاکھ (200,000) آدمی گرفتار کر لیے گئے، جب کہ ایمرجنسی کے زمانہ میں ڈیڑھ لاکھ اور کوئٹ انڈیا تحریک کے زمانہ میں صرف ساٹھ ہزار آدمی پکڑے گئے تھے۔ اس طرح کی غیر معمولی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۰ اکتوبر کو بابری مسجد ڈھانے کا منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ ساری کوششوں کے باوجود مسجد نہیں گری، اگرچہ وی پی سنگھ کی حکومت گر گئی۔

یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ویسا ہی ایک واقعہ ہے جو ۱۴۲۰ سال پہلے مکہ میں ابرہہ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ خدا نے اجودھیا میں مداخلت کی۔ دوبارہ "چڑیوں کا جھنڈ" ظاہر ہوا اور اس نے مخالفین کے سارے منصوبہ کو تہس نہس کر دیا۔

مزید یہ کہ مسجد محض در و دیوار کا نام نہیں۔ مسجد عالم اسلام کی چوکیدار ہے۔ آپ دنیا کا سفر کریں تو آپ دیکھیں گے کہ دوسری قوموں نے اپنی حفاظت کے لیے شہروں کے گرد حصار بنائے اور بڑے بڑے قلعے کھڑے کیے۔ مگر مسلمان جہاں بھی گئے وہاں انھوں نے مسجدیں بنائیں اور اس کے میناروں پر کھڑے ہو کر اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) کی حقیقت کا اعلان کیا۔

تاریخ تصدیق کرتی ہے کہ مسجد نے بار بار اپنی اس حارسانہ حیثیت کو ثابت کیا ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں منگول (تاتاری) وحشی طوفان کی طرح ابھرے۔ انھوں نے سمرقند سے لے کر حلب اور بغداد تک تمام مسجدوں کو ڈھا دیا۔ مگر پچاس سال میں پورا نقشہ بدل گیا۔ چنگیز خاں اور ہلاکو کے بعد ان کے بیٹوں اور پوتوں نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے اپنے باپ دادا کی ڈھائی ہوئی مسجدوں کو دوبارہ اپنے ہاتھوں سے بنایا اور ان کے اندر عاجزانہ سجدہ کر کے اللہ کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کیا۔

اسلام کی اس فاتحانہ تاریخ کی موجودگی میں مسلمانوں کو اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔ اگر کچھ لوگ شیطان کے بہکاوے میں آکر ہلاکو کی تاریخ دہرانا چاہتے ہیں تو مسلمانوں کو دوبارہ اس خدائی معجزہ کا انتظار کرنا چاہیے جب کہ اسلام کی طاقت ظاہر ہو اور وہ ان کی نسلوں کو مسخر کر کے دوبارہ انھیں خدا کے دین کا معمار بنا دے۔

تخریب کے چیمپین تعمیر کے ہیرو بن جائیں، اور بلاشبہ خدائے ذوالجلال کے لیے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں۔

بے بنیاد خوف

متحدہ عرب امارات سے ایک عربی مجلّہ منار الاسلام کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ اس نے مارچ ۱۹۸۶ میں ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں ایک خصوصی رپورٹ چھاپی تھی۔ اس کا عنوان تھا: القضاء علی المسلمین فی الهند (ہندستان میں مسلمانوں کا خاتمہ) اس رپورٹ میں ہندستان کی بعض انتہاپسند ہندو تنظیموں کی خفیہ سازشوں کا "انکشاف" کیا گیا تھا جو رپورٹ کے مطابق ہندستان سے مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے لئے ۱۹۳۹ سے سرگرم ہیں۔

رپورٹ میں دکھایا گیا تھا کہ ایک ہندو فرقہ پرست تنظیم نے موجودہ صدی کی چوتھی دہائی میں اپنے کارکنوں پر مشتمل ایک خفیہ وفد اسپین روانہ کیا تھا۔ تاکہ وہاں جاکر وہ گہرائی کے ساتھ اس بات کا جائزہ لے کہ وہاں کے عیسائیوں نے کس طرح اسپین کی سرزمین سے مسلمانوں کا خاتمہ کیا۔ اور پھر ہندستان میں بھی اسپین کی اسی قدیم تاریخ کو دہرایا جاسکے۔

حیدر آباد کے ماہنامہ رہگذر (مئی ۱۹۸۷) میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا: ہندستان میں مسلمانوں کا صفایا کس طرح کیا جائے گا، ہندو نازی ہسپانیہ کے نقش قدم پر۔ صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ:

"ہندستان کے ہندو نازیوں نے اس صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں اس مضمون کا گہرا مطالعہ کیا کہ کس طرح اسلام کو ہسپانیہ سے نکال باہر کیا گیا۔ انھوں نے اس کا مطالعہ خاص طور پر کیا تاکہ اس کی نقل ہندستان میں بھی کی جائے۔ آج ہندو نازی حکومت کے اندر اور باہر ہر جگہ باقاعدگی سے ہسپانوی طریقے اختیار کر رہے ہیں"

مضمون میں دکھایا گیا تھا کہ ہسپانیہ کی منظم عیسائی جماعتوں اور فرڈیننڈ کی حکومت نے وہاں سے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے نو طریقے اختیار کئے تھے۔ اب یہی نو طریقے ہندستان میں بھی مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے جارہے ہیں۔

یہ بات پچھلی نصف صدی سے مختلف شکلوں میں کہی جارہی ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کے دینی اور علمی حلقوں میں اس کا بار بار چرچا کیا گیا ہے۔ مسلم خطیبوں نے اپنی تقریروں میں اور اصحاب

قلم نے اپنی تحریروں میں مسلمانوں کو اس مفروضہ خطرہ سے ہوشیار کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ ملی تشخص کی حفاظت اور نئی نسل کے مستقبل کے تحفظ کی تحریکیں زیادہ تر اسی مخصوص ذہن کی پیداوار ہیں۔

یہ سراسر بے بنیاد خوف ہے جو لغویت کی حد تک بے معنی ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے کسی دیہاتی سے ایک شخص نے کہا کہ تمہارا کان کوا لے گیا۔ وہ دیہاتی آدمی کوے کے پیچھے دوڑنے لگا۔ اس نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر یہ دیکھنے کی کوشش نہ کی کہ اس کا کان بدستور اس کے سر پر موجود ہے۔

اسپین کا مذکورہ واقعہ اب سے پانچ سو سال پہلے پیش آیا۔ وہ زمانہ آج کے دور سے سراسر مختلف تھا۔ اس زمانہ میں بادشاہ کی زبان قانون ہوا کرتی تھی۔ اخبارات اور ریڈیو موجود نہ تھے جو کسی مقامی خبر کو عالمی سطح پر پھیلا سکیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل اور اقوام متحدہ جیسے ادارے موجود نہ تھے جو ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج کریں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس وقت عالمی حالات کا وہ دباؤ موجود نہ تھا جو آج ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے پانچ سو سال کے اندر دنیا کے حالات اتنے زیادہ بدل چکے ہیں کہ اب یہ بالکل ناممکن ہو گیا ہے کہ کوئی بھی طاقت، خواہ وہ سپر پاور ہی کیوں نہ ہو، کسی انسانی مجموعہ کے خلاف اسپین جیسی تاریخ کو دہرا سکے۔

تاہم تھوڑی دیر کے لئے ان تمام ناممکنات کو ممکن فرض کر لیجئے۔ اور متعلقہ اعداد و شمار کی روشنی میں یہ حساب لگائیے کہ بالفرض اگر موجودہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ وہ المناک تاریخ دہرائی جائے جو اسپین میں قدیم مسیحی حکمرانوں نے دہرائی تھی تو اس تاریخی عمل کو اپنی آخری حد تک پہنچانے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوگا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اسپین میں مسلمان ۷۱۲ء میں داخل ہوئے۔ وہاں ان کی حکومت ۸۰۰ سال تک باقی رہی۔ زوال کا شکار ہونے کے بعد، اسپینی مسلمانوں کی سیاسی قوت کا آخری مرکز غرناطہ تھا۔ جو ۱۴۹۲ء میں ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

۱۴۹۲ء میں جب آخری مسلم سلطان نے مسیحی حکمراں کے حق میں دست برداری لکھ دی اور غرناطہ سے روتا ہوا رخصت ہوا، اس کے بعد چرچ اور حکومت کے منصوبے کے تحت اسپین سے مسلمانوں کو

ختم کرنے کی مہم شروع کردی گئی۔ مگر ظلم اور سفاکی کے تمام طریقوں کو اختیار کرنے کے باوجود، اس مہم کی تکمیل میں ۱۲۰ سال لگ گئے۔ مسلمانوں کا آخری قافلہ ۱۶۱۲ء میں اسپین سے نکل سکا۔

اب فرض کیجئے کہ ہندستان میں قدیم اسپین کی تاریخ دہرائی جاتی ہے، اور یہ بھی فرض کرلیجئے کہ یہ عمل کسی بھی اندرونی یا بیرونی مداخلت کے بغیر بلا روک ٹوک مسلسل جاری رہتا ہے۔ تمام خلاف قیاس باتوں کو فرض کرنے کے بعد جو صورت حال پیش آئے گی، وہ تاریخی معلومات کے مطابق یہ ہوگی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اپنے آرٹیکل اسپین کی تاریخ (History of Spain) میں بتایا ہے کہ مسلمانوں کی فتح کے وقت اسپین کے باشندوں کی کل تعداد تخمیناً چالیس لاکھ تھی۔ جو عرب مسلمان اسپین میں داخل ہوئے، ان کی تعداد تقریباً پچاس ہزار تھی۔ اس تعداد میں دو طریقے سے اضافہ ہوا۔ ایک، توالد وتناسل کے ذریعہ۔ اور دوسرا، ان عیسائیوں کی شکل میں جو اسلام قبول کرکے مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہوگئے۔ اس طرح آخری دور میں اسپین کے پانچ بڑے شہروں میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد تین لاکھ ستاسی ہزار (387,000) تھی۔ (EB-17/419)

حساب کی آسانی کے لئے اسپین سے مسلمانوں کے خاتمہ کی مدت کو ایک سو سال مان لیجئے۔ اور اسپینی مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کرکے اس کو پانچ لاکھ فرض کرلیجئے۔ اب دیکھئے کہ اسپین کی آزمودہ تدبیر کو اگر ہندستان میں اختیار کیا جائے تو یہاں کے ۲۰ کروڑ مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے لئے کتنی زیادہ مدت درکار ہوگی۔

علم الحساب بتاتا ہے کہ خاتمۂ نسل کے اس عمل کے پورا ہونے میں چالیس ہزار سال لگ جائیں گے۔ ایک سو سال میں پانچ لاکھ انسانوں کو ھلاک کرنے کی رفتار سے جو مدت قرار پاتی ہے وہ یہی ہے۔

واضح ہو کہ خاتمۂ نسل کے لئے ۴۰ ہزار سال کی یہ مدت بھی اس وقت ہے جب کہ اس درمیان میں کوئی بھی ناموافق صورت حال پیش نہ آئے۔ مثلاً توالد وتناسل کے ذریعہ مسلمانوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ ہندو اپنی موجودہ طاقت کو مسلسل چالیس ہزار سال تک برقرار رکھیں۔ کوئی عالمی واقعہ اس رفتار میں خلل نہ ڈالے۔ ہندوؤں کے ساتھ وہ واقعہ نہ ہو جو تاتاری ظالموں

کے ساتھ ہوا جنھوں نے پچاس برس کے اندر اسلام قبول کر لیا۔ حتی کہ چالیس ہزار سال تک قیامت کی آمد بھی رکی رہے۔ وغیرہ۔

اس طویل مدت کے دوران اگر کوئی بھی ناموافق صورت حال پیش آجائے تو مذکورہ عمل کی تکمیل کی مدت دگنا یا اس سے بھی زیادہ ہوجائے گی۔ کیا کوئی شخص بقید ہوش و حواس اس قسم کے ایک عمل پر یقین کر سکتا ہے۔ کیا تاریخ میں کسی بھی ایسے انسانی ظلم کی مثال موجود ہے جو چالیس ہزار سال تو درکنار، چار سو سال بھی مسلسل جاری رہا ہو۔ پھر اس قسم کے بے بنیاد مفروضہ سے اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔

"دوسرا اسپین" نحوی اعتبار سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے سراسر غلط ہے۔ بہت سے فیصلہ کن پہلو ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ کو قدیم زمانہ سے بالکل مختلف بنادیا ہے۔ وہ مذہبی تشدد کا زمانہ تھا، آج مذہبی رواداری کا زمانہ ہے۔ وہ بادشاہت کا دور تھا، اب جمہوریت کا دور ہے۔ وہ واقعہ پریس کے دور سے پہلے پیش آیا۔ اب پریس اور ریڈیو کے دور نے صورت حال کو یکسر بدل دیا ہے۔ اُس وقت کوئی "اقوام متحدہ" نہ تھا، آج اقوام متحدہ کی صورت میں انسانی حقوق کے تحفظ کا بین اقوامی ادارہ موجود ہے جس کا خود ہندستان بھی ایک رکن ہے اور جس کے چارٹر پر اس نے بھی دستخط کئے ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ

مزید یہ کہ اس قسم کے بھیانک واقعات کبھی بھی تاریخ میں دوسری بار دہرائے نہیں جاتے۔ اس قسم کا وحشیانہ واقعہ جب ایک بار پیش آکر مشہور عام ہو جائے تو پورا عالمی ضمیر اس کے خلاف متحرک ہوجاتا ہے۔ اس طرح ایسے کسی واقعہ کا ایک بار پیش آنا بذات خود اس کے لئے مانع بن جاتا ہے کہ وہ دوبارہ پیش آئے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ امریکہ نے جاپان میں ۱۹۴۵ میں دو ایٹم بم گرائے۔ مگر اس کے بعد ویٹ نام کی جنگ پیش آئی تو ایٹم بم رکھتے ہوئے بھی وہ ان کو استعمال نہ کرسکا۔ امریکہ کے لئے یہ جنگ قومی ساکھ کی جنگ تھی۔ اس نے اس بارہ سالہ جنگ میں اپنی تمام طاقت لگادی۔ حتی کہ امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ایک جنگ میں اس کے ۸۰۰۰ ۵ فوجی ھلاک ہوگئے۔ اس کے باوجود امریکہ کے لئے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ وہ اس جنگ کا فیصلہ اپنے حق میں کرنے کے لئے ایٹم بم استعمال

کرے۔ آخر کار امریکہ جنوری ۱۹۷۳ میں یک طرفہ پر اس جنگ سے علٰحدہ ہوگیا۔ بالفاظ دیگر، امریکہ نے ویت نام میں پسپائی اختیار کرلی مگر وہ دوسری بار ایٹم بم گرانے کی ہمت نہ کرسکا۔

جو لوگ دوسرے اسپین کی باتیں کرتے ہیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ بولنا نہیں جانتے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے حدیث میں ارشاد ہوا ہے: من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت (جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ خیر کی بات بولے ورنہ خاموش رہے)

خلاصۂ کلام

جو لوگ "دوسرے اسپین" کی بات کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہندو نازی پچھلے پچاس سال سے خاتمۂ نسل کے اس منصوبہ کو زیر عمل لانے میں مصروف ہیں۔ مگر خود یہی واقعہ اس خطرے کو بے اصل ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ خاتمۂ نسل کی اس منظم کوشش کے باوجود پچھلے پچاس سال کے اندر اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد دگنی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔

عقل کہتی ہے کہ تاریخ کے بارہ میں پیشگی اندازے اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں۔ اسلام بتاتا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، فیصلۂ خداوندی کے تحت ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل اور دین دونوں کا تقاضا ہے کہ اگر کوئی خطرہ فی الواقع عملاً پیش آجائے تو اس سے بچنے کی تدبیر ضرور کرنا چاہئے۔ مگر جو خطرہ پیش نہیں آیا، جو ابھی مستقبل کے مفروضہ خطرہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی بابت سوچ کر غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو پریشان نہ کیا جائے۔

دوسرے اسپین کا معاملہ تو اس سے بھی آگے کا ہے۔ اب تک کے تمام عقلی اور تاریخی اندازوں کے مطابق وہ سرے سے وقوع میں آنے والا ہی نہیں۔ پھر ایسے بے بنیاد خطرہ کا اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔

ہندستان کدھر

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کو ایک ایسا دھماکہ خیز واقعہ ہوا جو غالباً ہندستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ وہ شہر جس کا نام ہندو بزرگوں نے ایودھیا رکھا تھا، یعنی وہ مقام جہاں تشدد نہ ہو۔ وہاں ہندو انتہاپسندوں کی ایک بھیڑ خلاف قانون طور پر جمع ہوئی۔ اس نے تشدد کا مظاہرہ کرتے ہوئے بابری مسجد کے اطراف کی پختہ چہار دیواری کو توڑ دیا۔ مسجد کے ایک گنبد کو نقصان پہنچایا پھر وہ اس کے اوپر چڑھ گئے اور اس کے تینوں گنبدوں پر اپنا بھگوا جھنڈا لہرا دیا۔ اس لاقانونیت کو روکنے کے لئے پولیس نے گولی چلائی جس میں ۲۵ سے زیادہ آدمی ہلاک ہوگئے۔

ایودھیا میں مجنونانہ تشدد کا یہ مظاہرہ اس وقت کیا گیا جب کہ بابری مسجد۔ رام جنم بھومی کا قضیہ ملکی عدالت میں زیر سماعت ہے۔ اس بنا پر حکومت نے اور ملک کے تمام منصف مزاج لوگوں نے بار بار یہ اپیل کی تھی کہ ہندو انتہاپسند عدالت کا احترام کرتے ہوئے اس کے فیصلہ کا انتظار کریں۔ عدالتی فیصلہ آنے سے پہلے بطور خود کوئی کارروائی نہ کریں۔ مگر تمام اپیلوں کو نظر انداز کر کے وہ اپنے گھروں سے نکلے تاکہ ایودھیا میں داخل ہو کر یودھ کریں اور پھر پورے ملک میں نفرت اور تشدد کی لہر پھیلا دیں۔

یہ واقعہ ہندستان کی رواداری کے اس تصور کے سراسر خلاف ہے جو ہزاروں سال سے اس ملک میں چلی آرہی ہے اور جس کو اب تک ہندستان کا پرفخر سرمایہ سمجھا جا رہا تھا۔ یوپی اور مرکزی حکومت نے چالیس کروڑ روپیہ کے خرچ سے اس کا انتظام کیا تھا کہ وہ رواداری کی اس قدیم روایت کو بچا سکیں۔ مگر مجنونانہ سیلاب کے آگے قانون اور ایڈمنسٹریشن کے بند بھی ٹوٹ گئے۔ کارسیوکوں نے اپنی حد تک تخریب کاری میں کمی نہیں دکھائی۔ اس واقعہ کی رپورٹ کافی تفصیل کے ساتھ اخباروں میں آچکی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۳۱ اکتوبر) نے بالکل درست طور پر لکھا ہے کہ ہندو فرقہ کی زیادہ بڑی تعداد کبھی اس سے اتفاق نہیں کرے گی۔ بلکہ ہندوؤں کی نہایت عظیم اکثریت کے لئے یہ واقعہ سخت پریشانی حتی کہ شرم کا باعث ہوگا:

Their "achievement", such as it is, will generate feelings of acute embarrassment, not to speak of shame, among an overwhelming majority of Hindus.

نئی دہلی کے دوسرے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (یکم نومبر ۹۹۰) نے اس معاملہ کو ایک کارٹون میں کامیاب طور پر دکھایا ہے جو اس کے صفحہ اول پر چھپا ہے۔ اس کارٹون میں کھیل کا ایک میدان دکھایا گیا ہے۔ اس میدان میں ایک طرف ہندستان کے سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ کھڑے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر ایل کے اڈوانی پرجوش طور پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دونوں اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی دو انگلیوں سے وکٹری (V) کا نشان بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے ایک دبلا کمزور آدمی نہایت خستہ حالت میں زمین پر گرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس ہاری ہوئی لاش کے اوپر لکھا ہوا ہے : انڈیا۔

موجودہ ہندستانی لیڈر جس سیاسی پالیسی پر چل رہے ہیں، یہ کارٹون اس کی نہایت صحیح تصویر ہے۔ یہ لوگ ملک کی بربادی کی قیمت پر اپنی سیاسی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نفرت اور تعصب اور تشدد کو جگا کر اس کے ذریعہ سے ملک کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۰ کے آخر میں جو حالات
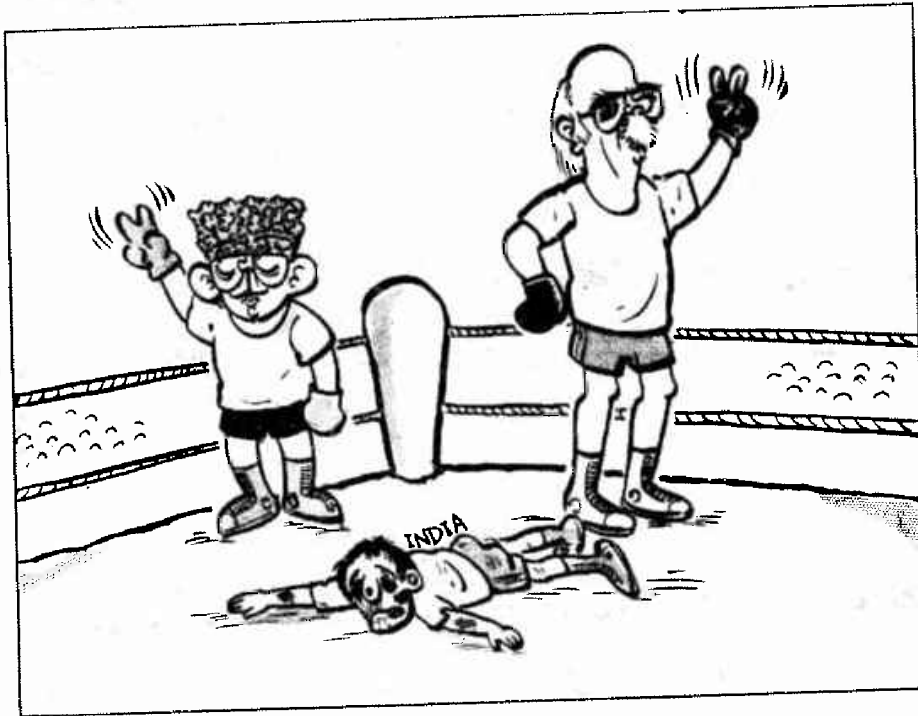
لیڈر کی جیت ملک کی ہار

سامنے آئے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ یہ لیڈر اپنی پالیسی میں کامیاب ہیں۔ ان کی تباہ کن پالیسی نے اگرچہ ملک اور قوم کو بربادی کے آخری کنارے پر پہنچادیا ہے، تاہم یہ لیڈر خود اس قابل ضرور ہو گئے ہیں کہ وہ، کم ازکم وقتی طور پر، اپنی سیاسی فتح کی خوشی کا جشن منا سکیں۔

پچھلے چند سالوں میں ہندستان میں مذہب کے نام پر سیاست کا جو تخریبی کھیل کھیلا گیا ہے، اس میں لیڈر لوگ جیت گئے مگر ملک ہار گیا۔ لیڈروں نے اپنا شاندار قلعہ ضرور کھڑا کر لیا ہے، مگر ان کا یہ سیاسی قلعہ صرف ملک کے کھنڈر پر بن کر کھڑا ہوا ہے۔

ہندستان کا ضمیر اس المناک حادثہ پر چیخ اٹھا ہے۔ بجا طور پر لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ تشدد دانہ حملہ " بابری مسجد " پر نہ تھا بلکہ خود ہندو دھرم کی اپنی مقدس روایات پر تھا۔ چنانچہ ملک کے بے شمار لوگوں نے تقریر اور تحریر کے ذریعہ اس کی مذمت کی اور اس کے بارہ میں اپنے درد وکرب کا اظہار کیا۔ ہندوؤں کی کم ازکم ۷۵ فی صد تعداد نے اس کو برا بتایا۔

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اکتوبر ۱۹۹۰) نے اپنے صفحہ اول پر ایک ایڈیٹوریل شائع کیا ہے۔ اس غیر معمولی اڈیٹوریل بعنوان مضطرب ہندستان (Anguished India) میں اس نے لکھا ہے کہ :

> The BJP and the VHP clearly failed to realise that whipping up atavistic passions for political gain would give them at best a pyrrhic victory (p.1)

بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد واضح طور پر یہ سمجھنے میں ناکام رہے ہیں کہ سیاسی مقصد کے لئے پشتینی جذبات کو بھڑکا کر وہ زیادہ سے زیادہ جو چیز پائیں گے وہ ان کے لئے صرف ایک تباہ وبرباد فتح ہوگی۔

تلخ حقیقت

ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈر کیا کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مغل دور میں ہمارے اوپر ظلم کیا گیا ہے۔ اب ہم اس کا انتقام لیں گے۔ اس سے قطع نظر کہ ظلم کا دعوی صحیح ہے یا غلط۔ سوال یہ ہے کہ اگر مغل حکمرانوں نے ظلم کیا تو ان کو اپنے "ظلم" سے کیا ملا۔ اس کا نتیجہ جو ان کے حصہ میں آیا وہ صرف یہ تھا کہ ان کی

حکومت کمزور ہوگئی۔ اور آخر کار ۱۸۵۷ میں وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

اسی طرح ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈر کہتے ہیں کہ انگریزوں نے ہمارے اوپر ظلم کیا۔ اس سے قطع نظر کہ ظلم کا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ دوبارہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اپنے "ظلم" سے کیا ملا۔ ان کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ ملک کے اندر ان کے اقتدار کی جڑیں اکھڑ گئیں۔ اور ۱۹۴۷ میں آخری طور پر ان کا اقتدار ختم ہوگیا۔

ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈر کہتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے بعد کانگرس پارٹی کی جو حکومت بنی، اس کی پالیسی اقلیت کو خوش کرنے (appeasement) کی تھی۔ چنانچہ وہ مسلسل ہندوؤں کے اوپر ظلم کرتی رہی۔ اس سے قطع نظر کہ ظلم کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ سوال یہ ہے کہ کانگریس کو اس "ظلم" سے کیا ملا۔ اس کو صرف یہ ملا کہ وہ کمزور ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ۱۹۸۸ کے الکشن نے اس کے حق میں اقتدار سے بے دخلی کا فیصلہ کر دیا۔

ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈروں نے دوبارہ ظلم کا طریقہ اختیار کیا ہے، وہ بھی اپنے پیش روؤں کی طرح ظلم کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ انتہا پسند لیڈر اپنے لئے کیا پسند کررہے ہیں۔ کیا وہ دوبارہ اسی تباہی کی سیٹ پر بیٹھنا چاہتے ہیں جس کو ان کے کہنے کے مطابق مغلوں اور انگریزوں اور کانگریسیوں نے خالی کیا ہے۔ اگر انھوں نے اپنے لئے اسی راستہ کا انتخاب کیا ہے تو کیا انھیں معلوم نہیں کہ قدرت کا قانون سب کے لئے یکساں ہے۔ وہ ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔ جس ظلم نے پچھلے حکمرانوں کو پیچھے دھکیل دیا، وہی ظلم نئے حکمرانوں کے ساتھ کیا اس کے سوا کوئی اور سلوک کرے گا جو وہ پچھلے حکمرانوں کے ساتھ کرتا رہا ہے۔ پھر یہ انتہا پسند لوگ اپنے لئے کس انجام کا انتظار کر رہے ہیں۔

ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈروں کو ممکن ہے کہ اپنی منفی سیاست کا یہ سیاسی فائدہ ملے کہ وہ ووٹروں کی ایک تعداد کی نظر میں ان کے قومی ہیرو بن جائیں۔ اس طرح ممکن ہے کہ وہ اگلا ملکی الکشن جیت لیں اور حکومت کی کرسیوں پر اپنے آپ کو پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں مگر جتنا امکان اس بات کا ہے، اس سے زیادہ امکان اس کا ہے کہ ان کی موجودہ مفسدانہ کارروائیوں کی بنا پر قدرت کا قانون ان کے خلاف حرکت میں آجائے۔ اس کے بعد وہ ظالموں کے خانہ میں لکھ دئے جائیں۔

اور آخر کار ذلت کے ساتھ انھیں اقتدار کی کرسیوں سے ہٹا دیا جائے جس طرح پچھلے لوگ ہٹا دئے گئے۔

موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کو عمل کا موقع دیا جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ قدرت کا قانون یہ بھی ہے کہ جب ایک گروہ سماج کے اندر فساد اور بگاڑ پیدا کرنے لگے تو اس کو ہٹا کر دوسرے گروہ کو اس کی جگہ پر لایا جائے۔ تبدیلی قیادت کا یہ قانون ساری انسانی تاریخ میں برابر جاری رہا ہے۔ اور بلاشبہ ہندستان قدرت کے اس عمومی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

وقار کی لڑائی

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ یہ ہندستان کے وقار کے خلاف تھا کہ باہر کی ایک قوم آکر یہاں حکومت کرے۔ چنانچہ اس کے خلاف آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ زبردست قربانیوں کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان آزاد ہوگیا۔

اب یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہندستان کے لوگ ایک ہوکر ملک کو ترقی دینے میں لگ جاتے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آزادی ملک کے بٹوارہ کے روپ میں آئی۔ ملک کے لوگ دو بڑے فرقوں کی صورت میں بٹ گئے۔ ایک نے مطالبہ کیا کہ "تقسیم ہند" دوسرے نے اس کو رد کرتے ہوئے کہا کہ "اتحاد ہند" اس حریفانہ سیاست کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی وقار کا مسئلہ ملک سے ختم نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی وہ "ہندو وقار" اور "مسلم وقار" کی صورت میں بدستور باقی رہا۔

۱۹۴۷ سے مسلسل یہ صورت حال جاری ہے کہ جب بھی کوئی نزاعی معاملہ پیدا ہوتا ہے تو موجودہ نفسیات کی بنا پر وہ فوراً دونوں فرقوں کے لئے وقار کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ مثلاً ہندوؤں کا ایک جلوس نعرہ لگاتا ہوا مسلم محلہ سے گزرتا ہے۔ اب وہاں کے مسلمان فوراً یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کا ملی وقار مجروح ہو رہا ہے۔ وہ مانگ کرتے ہیں کہ جلوس کی روٹ کو بدلا جائے۔ اس کے بعد ہندو وقار جاگ اٹھتا ہے۔ ہندو سمجھتا ہے کہ اگر میں نے اپنے جلوس کا راستہ بدلا تو میرا قومی وقار ختم ہو جائے گا۔ اب دونوں طرف سے ضد بڑھتی ہے۔ دونوں اس منفی نفسیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کو قرآن میں حمیت جاہلیہ کہا گیا ہے (الفتح ۲۶)

یہی صورت بابری مسجد ۔ رام جنم بھومی کے قضیہ میں پیش آئی۔ ۱۹۸۶ کے بعد جب یہ نزاع

بڑھی تو مسلمانوں نے کہا کہ ہمارے لئے یہ صرف ایک مسجد کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ملت کی موت وحیات کا مسئلہ ہے۔ اس لئے ہم اس معاملے میں کسی قیمت پر پیچھے ہٹنے والے نہیں۔ ہندؤوں نے کہا کہ یہ ہمارے لئے صرف ایک مندر کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ ہمارے لئے دوسری شکست (second defeat) کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ میں ہم نے بٹوارہ کو مان کر پہلی بار شکست قبول کرلی تھی۔ اب ہماری حکومت ہے۔ اب ہم دوسری بار شکست کو قبول نہیں کریں گے۔ اس طرح ایک سادہ سا مسئلہ دو فرقوں کے لئے وقار کا مسئلہ بن گیا۔ اور جب کوئی مسئلہ وقار کا مسئلہ بن جائے تو اس کی پیچیدگی ہزاروں گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

وقار کی یہ لڑائی پچھلے پچاس سال سے جاری ہے اور اس نے ہندستان کی ترقی کے سفر کو ایک بند گلی (impasse) کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ جب تک وقار کا جھگڑا ختم نہ ہو، ملک کی ترقی کا سفر دوبارہ جاری ہونے والا نہیں۔

تاریخ کا تجربہ ہے کہ اس طرح کا مسئلہ کبھی دو طرفہ بنیاد (bilateral basis) پر ختم نہیں ہوتا۔ اس قسم کا پیچیدہ مسئلہ جب بھی ختم ہوتا ہے، وہ یک طرفہ بنیاد (unilateral basis) پر ختم ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ یک طرفہ اقدام کون کرے۔

حالات کا بے لاگ تجزیہ بتاتا ہے کہ ہندو، کم از کم موجودہ حالات میں، اس یک طرفہ اقدام کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوسکتا۔ ہندو نفسیات کی پیچیدگی یہ ہے کہ ابھی تک وہ ”فرسٹ ڈیفیٹ“ کا صدمہ لئے ہوئے ہے۔ اور اب چوں کہ ملکی نظام میں اس کو بالادستی (upper hand) حاصل ہے، اس لئے وہ کسی بھی حال میں اس چیز کو قبول کرنے پر راضی نہیں جس کو وہ اپنی موجودہ نفسیات کے تحت اپنے لئے سکنڈ ڈیفیٹ کا مسئلہ سمجھتا ہے۔

ذہنی انتشار

آج ملک کے تمام ذہن اس معاملہ میں سخت سراسیمہ ہیں۔ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ ملک بدترین تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ مگر جب وہ مسئلہ کا حل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو عملی اعتبار سے انھیں کوئی بھی ممکن حل نظر نہیں آتا۔ مسٹر خوشونت سنگھ نے ہندستان ٹائمس (۳ نومبر ۱۹۹۰) میں قوم کی موجودہ حالت (state of the nation) پر ایک نوٹ شائع کیا ہے۔ اس میں وہ ملک کے موجودہ حالات اور اس پر اپنی گہری تشویش کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں کہ مجھے افسوس ہے کہ میں قارئین کو

مایوس کر رہا ہوں جو مجھ سے کوئی مثبت تجویز سننے کے امیدوار ہوں گے۔ مستقبل کے بارہ میں میرا ذہن بھی اتنا ہی منتشر ہے جتنا کسی دوسرے شخص کا:

I am sorry to disappoint readers who expect some positive suggestions from me. I am as confused about the future as everyone else.

حل کیا ہے

اس معاملہ میں سوچنے کا ایک طریقہ خالص فرقہ وارانہ ہے۔ یعنی ہندو مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرائیں اور مسلمان ہندوؤں کا قصور ثابت کریں۔ یہ طریقہ صرف متعصبانہ ذہنوں کو اپیل کر سکتا ہے، عام انسان اس کو کوئی اہمیت نہیں دے سکتا۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جس کو "منطقی انصاف" کہا جا سکتا ہے۔ یعنی معاملہ کو بالکل منطقی انداز میں دیکھ کر یہ طے کرنا کہ کس کی کتنی غلطی ہے اور کون کتنا قصوروار ہے۔ تمام سنجیدہ لوگ اسی انداز میں لکھ اور بول رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مسٹر موہن چرائی نے لکھا ہے:

"میری طرح کروروں ہندو اپنے ہم مذہب جنونی لوگوں کے دیوانہ پن سے گردن جھکانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ کیا اتنے بڑے ملک میں جہاں لاکھوں مندر اور تیرتھ استھان ہیں، ایک اور مندر نہ بننے سے ہندو دھرم کا ناش ہو جاتا۔ قصور صرف ہندو فرقہ پرستوں کا نہیں ہے، مجرم وہ مسلمان لیڈر بھی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی غربت، افلاس، بیکاری اور مایوسی کا فائدہ اٹھا کر اپنے مفادات کے لئے بابری مسجد کو ہندستان میں اسلام کی علامت قرار دے کر ہندو فرقہ پرستی کو پنپنے کا موقع دیا۔ کبھی یوم جمہوریہ کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کر کے، کبھی لانگ مارچ کا نعرہ بلند کر کے اور کبھی آدم فوج بنانے کا اعلان کر کے، وشو ہندو پریشد کے زندہ رہنے کا سامان کیا۔ مجرم تو وہ سیاست داں اور حاکم بھی ہیں جو رام جنم بھومی۔ بابری مسجد کے ڈھانچہ پر سیاسی محل کھڑے کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں" (قومی آواز ۲ نومبر ۱۹۹۰)

خالص منطقی اعتبار سے یہ بات صدفی صد درست ہے۔ مگر اپنی ساری درستگی کے باوجود یہ اصل مسئلہ کا حل نہیں۔ پیچیدہ اجتماعی مسائل میں اس قسم کا منطقی انصاف کبھی واقعہ نہیں بنتا۔ یہ انداز نظری اعتبار سے جتنا صحیح ہے، عملی اعتبار سے وہ اتنا ہی غیر مفید ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے پیچیدہ جھگڑوں کا عملی حل صرف یہ ہے کہ کوئی ایک فریق تنہا رِسک لینے پر آمادہ ہو جائے، وہ تنہا ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے معاملہ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دے۔

جب دوطرفہ بنیاد پر مسئلہ کو حل نہ کیا جاسکتا ہو تو اس کے بعد مسئلہ کو حل کرنے کی ایک ہی قابل عمل صورت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اس کو یک طرفہ بنیاد پر حل کیا جائے۔ ایسی حالت میں میں اپنے مسلمان بھائیوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس قربانی کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ وہ ملک کی ترقی کے لئے اور نتیجۃً خود اپنی ترقی کے لئے، یہ قربانی دیں کہ وہ یک طرفہ طور پر اپنے اندر سے وقار کی مذکورہ نفسیات کو ختم کر دیں۔ قرآن کے الفاظ میں وہ، کلمۂ جاہلیت کے مقابلہ میں کلمۂ تقویٰ کا ثبوت دیں (الفتح ۲۶) موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا یہی واحد ممکن حل ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جب بھی کوئی نزاع پیدا ہو تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اس کو یا تو نظر انداز کر دیں یا اسی محدود دائرہ میں رکھ کر اس کو حل کرنے کی کوشش کریں جس محدود دائرہ میں وہ مسئلہ ابتداءً پیدا ہوا تھا۔ مسلمان کسی بھی حال میں ہرگز ایسا نہ کریں کہ اس کو پوری ملت کے وقار کا سوال بنا دیں۔ یہ طریقہ مسلمانوں کے لئے یک طرفہ قربانی کے ہم معنی ہوگا۔ مگر جس دن مسلمانوں نے یہ قربانی دے دی، اسی دن ملک میں ترقی کا نیا سفر شروع ہو جائے گا۔ اور جو سفر شروع ہو جائے وہ آخرکار اپنی منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔

نزاعی مسئلہ کے حل کا یہی وہ یک طرفہ طریقہ ہے جس کا مظاہرہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ (۶۲۸ء) کے موقع پر کیا تھا۔ اس اصول کو ایک لفظ میں ــــــــ حدیبیہ اصول (Hudaibiya principle) کہا جاسکتا ہے۔ اس نازک موقع پر اگر مسلمان اس اصول کا مظاہرہ کریں تو وہ نہ صرف ملک کو رہنمائی دیں گے، نہ صرف اپنا ملی مسئلہ حل کریں گے بلکہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کے ایک قیمتی اصول کی شہادت دیں گے۔ اور بلاشبہہ اسلام کی شہادت سے زیادہ بڑا عمل اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

دوطرفہ مشکل

دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے تحت ۱۵ اگست ۱۹۹۰ کو ایک سمپوزیم ہوا۔ اس میں اعلیٰ ہندو دانشوروں نے حصہ لیا۔ اس کی مکمل کارروائی انسٹی ٹیوٹ کے منتھلی جرنل منتھن (Manthan) کے شمارہ ستمبر ۱۹۹۰ میں چھپی ہے۔

سمپوزیم کے ایک مقرر ٹائمس آف انڈیا کے سابق ایڈیٹر شری گری لال جین تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ عام تصور کے خلاف، ملک کے سامنے بنیادی مسئلہ، جیسا کہ میرا خیال ہے، ہندو مسلم مسئلہ نہیں ہے اور نہ کبھی تھا۔ بنیادی مسئلہ دراصل ہندو ہندو مسئلہ ہے۔ یہی پہلے بھی تھا، اور یہی مستقبل بعید تک باقی رہے گا۔ ہندو سماج، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، نہایت گہرائی کے ساتھ ذات کی بنیاد پر بٹا ہوا ہے۔ آزادی کے بعد سے ملک کے با اختیار طبقے کی ہر کوشش جو اس کی اصلاح کے لئے کی گئی اس نے صرف اس کشمکش میں اضافہ کیا۔

اس کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ ہم وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی عظیم قیادت کے تحت ملک میں خانہ جنگی کے حالات دیکھ رہے ہیں۔ ہندستان کی آزادی خونی حالات میں آئی۔ آزادی بار بار خون میں نہلائی گئی ہے۔ میں یہ اندوہناک احساس رکھتا ہوں کہ جو کچھ ہم نے ماضی میں دیکھا ہے

Contrary to the popular perception, the central issue before the country, as I see it, is not, and has not been, the Hindu-Muslim problem. The central issue has been, and is going to remain for the foreseeable future, the Hindu-Hindu problem. The Hindu society, it is a commonplace, is deeply fragmented along caste lines, and since independence every 'care' has been taken by many of those in charge of the country's affairs to see to it that those conflicts get aggravated. Finally, under the 'great' leadership of Vishwanath Pratap Singh, we face conditions of near civil war.

I view the future of India — I am sorry to say on Independence Day with deep misgivings. Independence itself, you will recall, was born in bloodshed. Independence has since then been bathed in blood again and again. I have the terrible feeling that what we have seen in the past will pale into insignificance in comparsion with what awaits us in the future. I do not believe that anything like sensible political order is likely to emerge in this country in the near future, or indeed forseeable future. The Muslim problem is only one expression of this failure of the Hindus to create and sustain a political order which conforms to their genius and needs.

وہ اس کے مقابلہ میں بہت ہلکا ہے جو مستقبل میں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ میرا یقین نہیں کہ ملک میں آئندہ کوئی ایسی چیز ظاہر ہونے والی ہے جس کو معقول سیاسی نظام کہا جاسکے۔ مسلم مسئلہ ہندوؤں کی اس ناکامی کا صرف ایک اظہار ہے کہ وہ ملک میں ایسا سیاسی نظام قائم نہ کرسکے جو ان کی اہلیت اور ملکی ضرورتوں کے مطابق ہو (صفحہ ۲۶ - ۲۷)

مسٹر گری لال جین نے جو بات یہاں کہی وہ بے حد قابل غور ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو سماج کی بنیاد چار ورن (caste system) پر ہے۔ کاسٹ سسٹم ہندو ازم کا لازمی جزء ہے۔ ہندو ازم کی نفی کی قیمت پر ہی تقسیم انسانیت کے اس اصول کو چھوڑا جاسکتا ہے۔ ہندو ازم کو مانتے ہوئے اس اصول کا انکار ممکن نہیں۔ کیوں کہ یہ اصول ہندو ازم کی مقدس کتابوں میں واضح طور پر درج ہے۔ مثال کے طور پر رگ وید میں سماج کو چار درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ ان کا نیچا اور اونچا ہونا ہے۔ اس کے مطابق برہمن، کشتری، ویش اور شدر، بالترتیب خدا کے منھ، بازو، ران اور پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔

برہمن کا کام مذہبی رسوم ادا کرنا ہے، کشتری کا کام فوجی ذمہ داریوں کو سنبھالنا ہے۔ ویش کا کام زراعت کرنا اور شدر کا کام خدمت کرنا ہے۔ (EB-X/361)

ہندو سماج میں یہ تصور کتنی گہرائی کے ساتھ جما ہوا ہے، اس کا ایک مظاہرہ ۱۹۹۰ میں منڈل کمیشن کے خلاف تحریک کی صورت میں ہوا۔ یہ تحریک اتنی شدید تھی کہ تقریباً ۱۰۰ ہندو نوجوانوں نے خودسوزی کا انتہائی اقدام کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ منڈل کمیشن نے پست طبقہ کے لوگوں کے لئے سرکاری ملازمتوں میں ۲۷ فیصد رزرویشن دے دیا تھا۔ اوپر کا ہندو طبقہ اس کو دیکھ نہیں سکتا تھا کہ پست طبقہ کے افراد اس طرح سرکاری سروسوں میں ان کے برابر پہنچ جائیں۔ اونچے طبقہ کے ہندو نوجوانوں نے اس کے خلاف اتنی زبردست تحریک چلائی کہ سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ کی حکومت ہل گئی۔ یہاں تک کہ ۷ نومبر ۱۹۹۰ کو مسٹر سنگھ نے اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا جس نے منڈل کمیشن کی تجاویز کو رائج کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

کاسٹ سسٹم ہندو قوم کے اتحاد میں ایک ابدی رکاوٹ ہے۔ اس سسٹم کے ہوتے ہوئے ہندو قوم کبھی متحد نہیں ہوسکتی۔ اور جہاں اتحاد نہ ہو وہاں طاقت کا وجود بھی نہیں۔

پھر ہندو قوم میں اتحاد لانے کا طریقہ کیا ہو۔ صف اول کے ایک ہندو جرنلسٹ (گری لال جین) نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندو قوم کے پاس متحد ہونے کی کوئی مثبت بنیاد موجود نہیں۔ وہ صرف منفی جذبہ کی بنیاد پر متحد ہو سکتی ہے۔ اور یہ منفی جذبہ موجودہ حالات میں صرف مسلم دشمنی ہے۔ موصوف نے لکھا ہے کہ ہم اینٹی مسلم احساس کو بھڑکا کر ہی ہندوؤں کو متحد کر سکتے ہیں۔ مگر منفی بنیاد پر پیدا کیا جانے والا اتحاد کبھی مثبت فائدہ کا سبب نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کا اتحاد تخریبی نتیجہ دکھا سکتا ہے مگر وہ تعمیری کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔

مسٹر گری لال جین نے ہندو سماج کی اس مشکل کا ذکر (ٹائمس آف انڈیا ۴ جولائی ۱۹۸۷) کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس طرح ہم دو طرفہ مشکل میں مبتلا ہیں۔ کیوں کہ جو چیز ممکن ہے وہ مطلوب نہیں اور جو چیز مطلوب ہے وہ ممکن نہیں:

Thus what is possible is not desirable,
and what is desirable is not possible.

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو سماج کتنی زیادہ بے بسی کی حالت میں ہے۔ وہ خود اپنی بنیاد پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس کو کھڑا ہونے کے لئے لازمی طور پر ایک خارجی سہارا درکار ہے۔ اگر یہ خارجی سہارا موجود نہ ہو تو اس کی دیوار اپنے آپ گر پڑے گی، بغیر اس کے کہ کسی نے براہ راست طور پر اس کو گرانے کی کوشش کی ہو۔

مسلمانوں کے نادان لیڈر بابری مسجد تحریک کو حد تناسب سے باہر لے گئے۔ انھوں نے بابری مسجد کے نام پر دھواں دھار تحریک چلاکر ہندوؤں کو یہی سہارا فراہم کر دیا۔ ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈروں نے مسلمانوں کے پر جوش قائدین کے لفظی طوفان کو بھرپور طور پر استعمال کیا۔ انھوں نے اس کے ذریعہ سے اپنی قوم میں اینٹی مسلم فیلنگ پیدا کر دی۔ وہ چیز جس کو ہندو لہر (Hindu wave) اور ہندو اتحاد کہا جاتا ہے، وہ تمام تر اسی اندھی اینٹی مسلم فیلنگ پر کھڑا ہوا ہے جس کا موقع خود ہمارے نادان لیڈروں نے ۱۹۸۶ اور ۱۹۹۰ کے درمیان اپنی سطحی کارروائیوں کے ذریعہ فراہم کیا۔

عبرت ناک

بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر مسٹر لال کرشن آڈوانی کی رتھ یاترا یکم اکتوبر ۱۹۹۰ کو سومناتھ سے شروع

ہوئی۔ اس کو دس ہزار کیلو میٹر کا سفر کرکے اجودھیا پہنچنا تھا۔ ۱۶ اکتوبر کو وہ دہلی میں داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے زبردست میٹنگ کی۔ اس میں انھوں نے اعلان کیا کہ ہمارا " رام رتھ " ضرور اجودھیا پہنچے گا اور ہم جنم بھومی پر رام مندر بنا کر رہیں گے۔ کوئی طاقت ہم کو اس سے روک نہیں سکتی۔

دہلی کے انگریزی اخبار اسٹیٹسمین (۱۸ اکتوبر ۱۹۹۰) میں اس میٹنگ کی پوری تفصیل چھپی ہے۔ مسٹر آڈوانی نے جو کچھ کہا، اس میں سے ایک بات یہ تھی کہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے وشو ہندو پریشد کے ساتھ اپنا وزن صرف اس وقت ڈالا جب کہ ۱۹۸۶ میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی بنائی گئی اور اس کمیٹی نے اس مسئلہ کو ایک عوامی مسئلہ بنا دیا:

> BJP had thrown its weight behind the Vishwa Hindu Parishad only when the Babri Masjid Action Committee had been formed in 1986 and made it a public issue. (p.9)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ بابری مسجد کے نام پر آل انڈیا سطح کی ایکشن کمیٹی بنانا اور اس مسئلہ کو عوامی مسئلہ کی حیثیت سے چاروں طرف پھیلانا، یہ اصل مسئلہ کے حل میں صرف ایک رکاوٹ تھا۔ کیوں کہ اس نے ہندوؤں میں جوابی تحریک پیدا کی اور ہندو زیادہ بڑی تعداد میں رام جنم بھومی کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو تو کچھ نہیں دیا۔ البتہ اس نے ہندو قوم کے لئے اتحاد کی بنیاد فراہم کر دی۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ نفرت دو طرفہ بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ یہ تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ فریقین میں سے ایک شخص اگر اپنا ہاتھ ہٹا لے تو تالی کا بجنا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ موجودہ ہندو اتحاد نفرت کی زمین پر قائم ہے، اور یہ نفرت کی زمین اس کو مسلمانوں کی طرف سے مل رہی ہے۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے بہترین حکمت عملی یہ ہے کہ وہ اپنے " ہاتھ " کو یک طرفہ طور پر سامنے سے ہٹا دیں۔ اس کے بعد تالی کا بجنا اپنے آپ بند ہو جائے گا۔ اس کے بعد نفرت کے غبارہ کی ہوا خود بخود نکل جائے گی، اور پھر جو فضا بنے گی وہ عین اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ہوگی۔

نادان دوست

نئی دہلی کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر کے شمارہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۰ میں مسٹر جے دوباشی کا مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہندو لہر (The Hindu Wave) ہے۔ دوصفحہ کے اس مضمون میں انھوں نے پرفخر طور پر لکھا ہے کہ ہندو مستقبل کی لہر ہیں، اور اڈوانی کی رتھ یاترا اس لہر کی ایک علامت ہے:

The Hindus are the wave of the future. And Advani's Rath Yatra is a symbol of that wave.

یہ بات مختلف انداز سے ان ہندو صاحبان کی طرف سے کہی جارہی ہے جو بابری مسجد کو ڈھا کر اس کی جگہ رام مندر بنانے کی پرتشدد مہم چلا رہے ہیں۔ اس عنوان پر جذباتی تقریریں کرکے انھوں نے شمالی ہند کے کچھ ہندوؤں کو اپنے ساتھ جمع کر لیا ہے۔ اس کو وہ "ہندو لہر" سے تعبیر کرتے ہیں۔

شری اڈوانی کا رتھ جس کو دس ہزار کیلومیٹر کا سفر طے کرکے سومناتھ سے اجودھیا پہنچنا تھا، وہ رام رتھ نہیں بلکہ نفرت اور تشدد کا رتھ تھا۔ اس کا مقصد منفی بنیاد پر ہندوؤں کو متحد کرنا تھا۔ اس تحریک کے پیچھے جو ذہن کام کر رہا ہے، اس کا اندازہ وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری مسٹر اشوک سنگھل کے بیانات سے ہوتا ہے۔ مثلاً انھوں نے ۷ نومبر ۱۹۹۰ کو دہلی میں تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو وارننگ دی کہ وہ اجودھیا کی بابری مسجد کو ڈھا کر وہاں رام مندر بنانے کے منصوبہ کی مخالفت نہ کریں۔ ورنہ ہم ملک کی تین ہزار مسجدوں کو ڈھا کر وہاں مندر بنانے کی تحریک شروع کر دیں گے (ٹائمس آف انڈیا ۸ نومبر ۱۹۹۰)

اس قسم کی باتیں جو بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے لوگوں کی طرف سے کہی جارہی ہیں، اور اس کے نام پر عوام کی بھیڑ اکٹھا کی جارہی ہے، کیا اسی کا نام ہندو لہر ہے۔ کوئی بھی شخص جو ہندو دھرم کو جانتا ہو، وہ اگر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو وہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ یہ ہندو لہر نہیں ہے، زیادہ صحیح لفظ میں وہ اینٹی ہندو لہر ہے۔ اور برعکس طور پر اس کو ہندو لہر کہا جارہا ہے۔

ہندو دھرم کی تعلیمات میں دو چیزیں بے حد بنیادی ہیں ۔ ایک رواداری ، اور دوسرے عدم تشدد ۔ آپ ہندو دھرم کی کسی بھی کتاب کو اٹھائیں ، اس میں آپ کو یہ دونوں باتیں لکھی ہوئی ملیں گی ۔ یہ ہندو دھرم کی وہ خصوصیات ہیں جن کا ذکر اس کے تمام مفکرین اور مصلحین نے پر فخر طور پر کیا ہے ۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) جلد ۸ میں ہندوازم (Hinduism) کے عنوان سے نہایت مفصل اور تحقیقی مقالہ ہے ۔ اس میں درج ہے کہ ہندوازم ، بطور اصول ، عقیدہ اور عبادت کے تمام طریقوں کا احترام کرتا ہے ۔ ایک ہندو ہر مذہب کو سچائی کا اظہار سمجھتا ہے ۔ ہندوازم بطور اصول کے ہر مذہب کے حق میں روادار (tolerant) ہے ، خواہ وہ کوئی بھی مذہب ہو (صفحہ ۸۸۸)

دوسری بات کے سلسلہ میں برٹانیکا میں بتایا گیا ہے کہ ہندوازم کا ایک نہایت اہم اصول اہمسا ہے ۔ یعنی تشدد نہ کرنا ۔ اسی لئے ہندوازم سختی کے ساتھ حیوان کے ذبیحہ کو منع کرتا ہے اور سبزی خوری پر زور دیتا ہے ۔ ہندو مفکرین کے مطابق ، اہمسا ہندو مذہب کی ایک بے حد بنیادی قدر ہے ۔ اہمسا ہندو اخلاقیات کا ایک مرکزی اصول (keystone) ہے (صفحہ ۸۸۹)

اس اعتبار سے دیکھئے تو رام جنم بھومی تحریک ، اپنی موجودہ شکل میں ، واضح طور پر ہندو دھرم کے خلاف ہے ۔ اس میں مذہبی رواداری کو کچلا جارہا ہے ۔ اس میں نفرت کا پرچار کیا جارہا ہے ۔ اس میں تشدد کا طریقہ اختیار کیا جارہا ہے ۔ اس بنا پر یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اس تحریک نے جو لہر پیدا کی ہے ، وہ اینٹی ہندو لہر ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں ہندو لہر ۔

یہی وجہ ہے کہ ملک کے ہزاروں ہندوؤں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے ۔ اور اس کو غیر ہندو تحریک بتایا ہے ۔ مثال کے طور پر آنجہانی کملاپتی ترپاٹھی ، ہندو دھرم کے ایک مسلّمہ عالم تھے ۔ انھوں نے اپنی آخر عمر میں جون ۱۹۹۰ میں " سامپرادائک سمیا " کے نام سے ہندی میں ایک مقالہ لکھا تھا جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے ۔ ہندستان ٹائمس (۲۰ اکتوبر ۱۹۹۰) میں اس کا انگریزی تعارف شائع ہوا ہے ۔ اس میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے مسئلہ کا بھی ذکر ہے ۔ مترجم کہتے ہیں :

Lambasting the Vishwa Hindu Parishad and the Rashtriya Swayam Sevak Sangh, the elderly statesman said the very idea of demolishing a mosque was a negation of Hindu ethos. "It is a fascist idea and will break the country," he added.

وشو ہندو پریشد اور راشٹریہ سوم سیوک سنگھ کو سخت برا بتاتے ہوئے، بزرگ سیاست داں نے لکھا ہے کہ مسجد کو ڈھانے کا تصور بجائے خود ہندو خصوصیات کی نفی ہے۔ یہ فاشسٹ نظریہ ہے، یہ نظریہ ملک کو توڑ ڈالے گا۔

موجودہ لہر اگر حقیقی معنوں میں "ہندو لہر" ہوتی تو اس سے وہ نتائج نکلتے جو ہندو دھرم کے امتیازی اوصاف سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ملک سے اہنکار ختم ہوتا، کیوں کہ ہندو تعلیمات میں اہنکار کو بہت برا مانا گیا ہے۔ اس سے دوسروں کے اعتراف کا دریا امنڈتا، کیوں کہ ہندو فکر کی یہ امتیازی صفت ہے کہ وہ سچائی کے تعدد کا قائل ہے، ہر اختلاف کو وہ سچائی کا نیا روپ سمجھتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں چاروں طرف رواداری کی ہوائیں چلتیں، کیوں کہ ہندو فکر یہ کہتا ہے کہ اپنے کو برحق سمجھتے ہوئے دوسرے کے برسرحق ہونے کا بھی اعتراف کرو، خواہ بظاہر وہ تمہارے نظریہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس لہر کے بعد پورے ملک میں امن وشانتی اور جان کے احترام کا ماحول دکھائی دیتا، کیوں کہ ہندو دھرم جان مارنے کو آخری حد تک برا سمجھتا ہے۔ حتی کہ ایک ہندو مفکر نے کہا کہ احساس کو مارنے ہی کا نام گناہ ہے اور احساس کو نہ مارنے کا نام ثواب:

Killing of a sensation is sin, and vice versa.

مگر عملاً ہم اس کے بالکل مختلف صورت حال دیکھ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اس لہر کو ہندو لہر کیسے کہا جا سکتا ہے۔

"اگروواد" میں یقین کرنے والے کچھ لوگ اگر تشدد اور تخریب کی تحریک چلائیں اور اپنی تقریروں سے عوام کی ایک بھیڑ اکٹھا کرلیں، اس کے بعد اس کا نام گاندھی لہر رکھ دیں تو کیا یہ صحیح ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ صحیح نہ ہوگا۔ کیوں کہ ایسی لہر حقیقتًہ اینٹی گاندھی لہر ہے نہ کہ گاندھی لہر۔

یہی معاملہ ان انتہا پسند ہندو بھائیوں کا ہے جن کو ٹائم میگزین (۵ انومبر ۱۹۹۰) نے جنگ جو (Militant Hindus) کہا ہے اور جو بابری مسجد کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں۔ وہ اپنی اس تحریک کو اس چیز کا حصہ سمجھتے ہیں جس کو وہ ہندتو کہتے ہیں۔ یہ تحریک باعتبار حقیقت مسلمانوں کے خلاف ہے۔ چنانچہ مسٹر ایل کے اڈوانی نے اس کی تشریح (minorityism versus nationalism) (اقلیت نوازی بمقابلہ قومیت) کے الفاظ میں کی ہے (انڈیا ٹوڈے، ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۰، صفحہ ۵۹)

اس موضوع پر ہمارے ہندو بھائی جو پرتشدد تحریک چلا رہے ہیں ، وہ واضح طور پر رواداری ، اہمسا اور ہر ایک کے احترام کے خلاف ہے جس کو ہندوازم کا بنیادی اصول بتایا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس تحریک کو بھی اینٹی ہندو لہر کا نام دیا جائے گا نہ کہ ہندو لہر کا۔

عقیدہ یا تاریخ

یہ حضرات کہتے ہیں کہ اجودھیا کی بابری مسجد عین رام جنم بھومی کے مقام پر بنی ہے، اس لئے ہم مسجد کو ڈھاکر دوبارہ وہاں رام مندر بنائیں گے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ کا دعویٰ تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا۔ مگر وہ اس پر دھیان دینے کے لئے تیار نہیں۔

مثال کے طور پر تاریخ بتاتی ہے کہ بابری مسجد ۱۵۲۸ میں بنائی گئی۔ اس کے تقریباً چالیس سال بعد تلسی داس (وفات ، بنارس ۱۶۲۳) اجودھیا جاتے ہیں۔ وہ وہاں کے مندروں کو دیکھتے ہیں اور رام کی زندگی پر اودھی زبان میں اپنی کتاب رام چرت مانس (۷۶-۱۵۷۴) لکھتے ہیں۔ اس تفصیلی کتاب میں رام کے بارے میں ہر چیز موجود ہے۔ مگر اس میں رام جنم بھومی پر بنے ہوئے مندر کو توڑ کر مسجد بنانے کوئی ذکر نہیں۔

حالانکہ یہ شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۲) کا زمانہ تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، اکبر ایک ہندو نواز بادشاہ تھا۔ اس کی ملکہ بھی ایک ہندو خاتون تھی۔ اگر مندر توڑنے کا واقعہ صحیح ہوتا تو اکبر جیسے بادشاہ کے زمانہ میں تلسی داس اس کی بے خوف وخطر نشاندہی کرتے کہ بابر کے حاکم میر باقی نے رام مندر کو توڑ کر وہاں مسجد بنادی تھی۔ تلسی داس اگر اس کا اعلان کرتے تو اس کے بعد یا تو فوراً شاہی فرمان نافذ ہوتا کہ اس عمارت کو ہندوؤں کے حوالہ کر دیا جائے۔ یا کم از کم تلسی داس کی کتاب میں اس کا ریکارڈ ہمارے پڑھنے کے لئے موجود رہتا۔

اس طرح کے حقائق جب پیش کئے جاتے ہیں تو مذکورہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ ہمارے عقیدہ کا مسئلہ ہے۔ اس معاملے میں ہم تاریخ کی کوئی بات نہیں سنیں گے اور نہ عدالت کا فیصلہ مانیں گے۔ کیونکہ مذہبی عقیدہ کا تعلق تاریخ اور عدالت سے نہیں ہوتا۔

یہ جواب سراسر غیر معقول ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مذہبی عقیدہ کا تعلق تاریخ یا عدالت سے نہیں ہوتا۔ مگر "مندر کو توڑ کر مسجد بنانے" کا مسئلہ مکمل طور پر ایک تاریخی مسئلہ ہے نہ کہ عقیدہ کا مسئلہ۔

اگر یہ کہا جائے کہ" رام وشنو کے اوتار تھے" تو یہ بلاشبہ عقیدہ کا ایک مسئلہ ہوگا۔ اس کو تاریخ اور قانون کے دائرہ میں زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔ مگر" فلاں مسجد مندر کو توڑ کر بنائی گئی" یہ بلاشبہ تاریخ کا مسئلہ ہے اور بصورت نزاع یقیناً اس کو تاریخ اور قانون کے دائرہ میں لاکر فیصلہ کیا جانا چاہئے۔

جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ ہندو سماج کی کوئی خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں۔ وہ ہندو سماج کو اس کی اعلیٰ روایات سے ہٹارہے ہیں۔ سوامی وویکانند کی امریکہ کے پارلیمنٹ آف ریلیجنز میں تقریر (۱۸۹۳) کے بعد سے اب تک ہزاروں ہندو پیشواؤں کو مغربی ملکوں میں زبردست استقبال ملتا رہا ہے۔ اس کی وجہ ہندو دھرم کی رواداری اور عدم تشدد کی روایات ہیں۔ اب کیا ہندوؤں کے انتہا پسند رہنما تاریخ کے اس پورے باب کو بند کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ ہندو دھرم کو اس کی اس کشش سے محروم کر دینا چاہتے ہیں جس نے مشرق و مغرب کے بہت سے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔
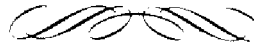
نیا دور

پچھلے پچاس برس سے تمام سطحی لیڈر یہ کہہ رہے تھے کہ جب اشتعال انگیزی کی جائے گی تو مسلمان ضرور مشتعل ہوں گے۔ یہ اصول سراسر غیر معقول اور غیر اسلامی تھا۔ لیکن مسلمانوں نے لیڈروں کے پر فریب الفاظ میں آکر اسے اختیار کر رکھا تھا۔ مگر حالات بتاتے ہیں کہ اب وہ اس فریب سے باہر آچکے ہیں۔ اب انھوں نے جان لیا ہے کہ اشتعال انگیزی ہو تب بھی انھیں مشتعل نہیں ہونا ہے۔ ان کے جذبات کو چھیڑا جائے تب بھی انھیں اعراض کرکے اس سے گزر جانا ہے۔

اکتوبر ۱۹۹۰ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر کی ۱۰ ہزار کیلو میٹر کی رتھ یاترا جو سومناتھ سے شروع ہوکر اجودھیا میں ختم ہونے والی تھی، اس نے اپنے طویل سفر کے دوران بار بار اشتعال انگیزی کی صورت حال پیدا کی۔ مگر مسلمان برابر اعراض کے اصول پر قائم رہے۔ ۳۰ اکتوبر کو بابری مسجد کے گنبدوں پر بھگوا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ اس کو ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا اور تمام اخبارات میں اس کی تصویریں چھپیں۔ اس دوران ملک کے مختلف حصوں میں درجنوں مقامات پر فسادات ہوئے۔

اس قسم کے مختلف اشتعال انگیز واقعات بار بار ہوتے رہے۔ مگر مسلمانوں نے ایک بار بھی کسی مقام پر ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہر موقع پر وہ کامل صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے رہے۔ وہ اپنے صابرانہ طریقہ سے فساد کی آگ کو بجھاتے رہے۔

یہ ایک عظیم الشان تبدیلی ہے جو ہندستانی مسلمانوں کی سیاست میں ۱۹۹۰ کے آخر میں ظہور میں آئی ہے۔ مسلمانوں نے پہلی بار اپنے نااہل لیڈروں کو رد کر دیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسلامی اصول کے مطابق، وہ اشتعال انگیزی کے مقابلہ میں صبر کی روش اختیار کریں گے، وہ برے سلوک کا جواب اچھے سلوک سے دیں گے۔

مسلمانوں نے اپنے اس نئے فیصلہ میں صرف ایک چیز کھوئی ہے، وہ ان کے نااہل لیڈر ہیں۔ اس کے سوا انھوں نے تمام چیزوں کو پالیا ہے۔ مسلمانوں کی یہ نئی دریافت انھیں مبارک ہو۔

نااہل لیڈروں کی غلط رہنمائی خود ان لیڈروں کو تو بہت کچھ دیتی رہی۔ مگر اس کے نتیجہ میں مسلمان پچھلی نصف صدی تک نہایت قیمتی چیزیں کھوتے رہے۔ اب انشاء اللہ اپنے نئے فیصلہ کے تحت وہ مزید

اضافہ کے ساتھ یہ تمام چیزیں پالیں گے۔

۱. اس کا ایک المناک نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان ہندستان میں غیر ضروری طور پر مایوسی کا شکار رہے۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ ہندستان میں ان کے لئے زندگی اور عمل کے مواقع نہیں ہیں۔ اور اس کی وجہ، نا اہل لیڈروں کے بیان کے مطابق، یہ تھی کہ ملک میں انھیں بعض اوقات ناخوشگوار حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔

حالات بتاتے ہیں کہ اب مسلمانوں نے یہ دریافت کرلیا ہے کہ ناخوشگواری کسی خاص ملک کی صفت نہیں بلکہ وہ دنیا کی صفت ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر جگہ، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، اس قسم کے حالات لازماً پیش آتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ حکمت اور تدبیر کے ساتھ ان سے نپٹا جائے۔ یہ حالات دراصل چیلنج ہیں اور چیلنج، خود تخلیق خداوندی کے مطابق، زندگی کا حصہ ہے۔ چیلنج کے ذریعہ ہی انسانیت ترقی کرتی ہے۔ اگر چیلنج نہ ہو تو انسانیت کا قافلہ معطل ہوکر رہ جائے۔

مجھے یقین ہے کہ اس دریافت کے بعد ہندستان کے مسلمان اس ملک میں نئے حوصلہ کے ساتھ زندگی کی تعمیر کریں گے۔

۲. لیڈروں کی غلط رہنمائی کا دوسرا نقصان جو پچھلے برسوں میں مسلمانوں کو اٹھانا پڑا وہ یہ تھا کہ وہ اسلام کی بتائی ہوئی ایک عظیم طاقت سے محروم ہوگئے۔ قرآن میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کوئی شخص تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تو تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا دشمن بھی تمہارا دوست بن جائے گا۔ (۴۱ : ۳۴)

اسلام کی یہ تعلیم ایک ایسا اخلاقی ہتھیار ہے جس کے اندر تسخیر کی لامحدود صلاحیت ہے۔ دور اول کے مسلمانوں نے اس اخلاقی طاقت کو استعمال کرکے اپنے بدترین دشمنوں کو زیر کرلیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان بھی اس اسلامی تعلیم کا یہ فائدہ حاصل کرسکتے تھے مگر نا اہل لیڈروں کی غلط رہنمائی نے انھیں اس نعمت سے محروم رکھا۔ اب مسلمانوں نے جو نیا سفر شروع کیا ہے اس میں ان شاء اللہ وہ اس اسلامی تعلیم کا بھرپور فائدہ حاصل کرسکیں گے۔

۳. نا اہل لیڈروں کی غلط رہنمائی کا ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ مسلمان ملک کی ایک اہم حقیقت سے بے خبر رہ گئے جو سراسر ان کی موافقت میں تھی۔ کوئی شخص اگر اپنے ماحول کے بارہ میں منفی انداز سے سوچنے

لگے تو اس کا لازمی نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس کو صرف "عسر" کا پہلو دکھائی دیتا ہے، "یسر" کا پہلو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس معاملہ کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں میں صرف ایک پہلو کا ذکر کروں گا۔

ٹائمس آف انڈیا (۹ نومبر ۱۹۹۰) کے آخری صفحہ پر ایک چھوٹی سی خبر چھپی ہے مگر وہ انتہائی اہم ہے۔ بمبئی کی ڈیٹ لائن کے ساتھ چھپنے والی اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ ٹائمس آف انڈیا اپنے سات ایڈیشنوں کے ساتھ اس وقت ملک کا سب سے زیادہ فروخت ہونے والا اخبار ہے جس کی ہر روز چھ لاکھ انتیس ہزار (629,000) کاپی فروخت ہوتی ہے۔ خبر کے مطابق اس سے پہلے انڈین ایکسپریس اپنے بارہ ایڈیشنوں کے ساتھ ملک میں سب سے زیادہ بکنے والا اخبار تھا۔ مگر آڈٹ بیورو آف سرکولیشن (ABC) کے تازہ اعلان کے مطابق، ٹائمس آف انڈیا نے پہلی بار سب سے زیادہ چھپنے والے اخبار کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا اپنی موجودہ اشاعت کے ساتھ ملیالا منورما (Malayala Manorama) سے بھی آگے بڑھ گیا ہے جس کی موجودہ اشاعت چھ لاکھ سات ہزار ہے۔

یہ خبر علامتی طور پر ملک کے ایک واقعہ کو بتاتی ہے۔ رام جنم بھومی تحریک کے سلسلہ میں ٹائمس آف انڈیا نے واضح طور پر اس کے مخالف رویہ اختیار کیا۔ ایڈیٹوریل، مضامین، خطوط اور خبروں کی صورت میں وہ مسلسل یہ تاثر دیتا رہا ہے کہ یہ پوری تحریک دقیانوسیت پر مبنی ہے اور وہ ملک کی ترقی کے لئے تباہ کن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رام جنم بھومی تحریک کے لوگ ٹائمس آف انڈیا کو اپنا دشمن اخبار بتاتے ہیں۔

اس وقت ملک کے جو حالات ہیں، ان میں ٹائمس آف انڈیا کی اشاعت کا بڑھنا علامتی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی سوچ وہی ہے جو ٹائمس آف انڈیا کی سوچ ہے۔ یہ طبقہ اس پوری تحریک کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔

مذکورہ خبر اس واقعہ کی صرف ایک علامت ہے۔ ورنہ مختلف صورتوں میں یہ بات بار بار سامنے آچکی ہے۔ ہندستان کے تمام بڑے بڑے ہندو مورخین نے اس معاملہ میں رام جنم بھومی کے دعویٰ کو غیر تاریخی قرار دے کر اس کی مذمت کی ہے۔ ان کی یہ مذمت عالمی سطح پر مشتہر ہو چکی ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ کے ٹائم میگزین نے بھی نمایاں طور پر اس کا اظہار کیا ہے۔

جو لوگ ہندی اور انگریزی اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں، انھیں یہ بات معلوم ہے کہ اس معاملہ میں ہندو تعلیم یافتہ لوگوں نے کثرت سے ایسے مضامین اور خطوط شائع کرائے ہیں جو حد درجہ حقیقت پسندانہ نقطہ نظر پر مبنی ہیں۔ جن لوگوں کو ہندی اور انگریزی اخبارات کے مطالعہ کا موقع نہ ملا ہو وہ مسلمانوں کے اردو اخبارات میں بھی ان کے اقتباسات دیکھ سکتے ہیں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ہندو قوم واضح طور پر دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک عوام کا طبقہ، اور دوسرے ان کے خواص کا طبقہ۔ یہ صحیح ہے کہ شمالی ہند کے ہندو عوام کی ایک تعداد رام جنم بھومی کے ساتھ ہے۔ مگر دوسرا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ ملک کے تعلیم یافتہ ہندو اور اسی کے ساتھ جنوبی ہند کے تقریباً تمام ہندو اس معاملہ میں حقیقت پسندانہ رائے رکھتے ہیں جو واضح طور پر مسلمانوں کی موافقت میں ہے۔

ماضی میں مسلمان اس حقیقت کا شعوری ادراک نہ کر سکے تھے۔ اب اپنے نئے ذہن کے تحت انشاء اللہ وہ اس حقیقت کا بھرپور ادراک کریں گے اور اس کے مطابق اپنے ملی منصوبوں کی تشکیل کریں گے۔

۴۔ وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری مسٹر اشوک سنگھل نے ۷ نومبر ۱۹۹۰ کو نئی دہلی میں ایک تقریر کی۔ انھوں نے اپنی اس تقریر میں جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک بات، ٹائمس آف انڈیا (۸ نومبر ۱۹۹۰) کی انگریزی رپورٹنگ میں ان الفاظ میں تھی:

He said Muslims should realise politicians cannot save them. If anybody can save them, it is the Hindu. They should learn to coexist with us and we will protect them, for every Hindu is secular.

مسٹر سنگھل نے ایک مناسب بات غیر مناسب الفاظ میں کہی ہے۔ اس بات کو کہنے کے لئے زیادہ صحیح الفاظ یہ ہیں کہ مسلمانوں کا مسئلہ کوئی بھی حکمراں حل نہیں کرے گا۔ مسلمان اپنا مسئلہ صرف اپنی کوشش سے حل کر سکتے ہیں۔

آزادی کے بعد مسلمان غلط رہنمائی کے نتیجہ میں، ہمیشہ حکومت اور انتظامیہ کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ الکشن کے مواقع پر پارٹیوں کو ہرا کر یا جتا کر ان سے بڑی بڑی امیدیں باندھتے

رہے۔ یہ سب بلاشبہ بے فائدہ تھا مسلمانوں کے لئے اس معاملہ میں مفید بات صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ برادران وطن سے اپنے تعلقات کو بہتر بنائیں۔ یہی ان کے لئے پہلے بھی درست طریقہ تھا اور آج بھی یہی ان کے لئے درست طریقہ ہے۔

مسلمان اور ہندو سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد ہیں۔ دونوں کا ایک ہی مشترک وطن ہے دونوں کا مفاد ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہیں۔ اگر کسی معاملہ میں کوئی اختلافی بات پیدا ہو تو اس پر اسی طرح تحمل اور بردباری کا انداز اختیار کریں، جس طرح وہ اپنے گھر اور خاندان میں اس طرح کے معاملات میں ہمیشہ کرتے ہیں۔

مسلمانوں نے اگر ایسا کیا تو اسلام کے مطابق، وہ اپنے قومی اور وطنی پڑوسی کے حقوق ادا کریں گے اور اسی کے ساتھ یقینی طور پر وہ اس امن کو بھی حاصل کر لیں گے جو انھیں اس ملک میں اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے درکار ہے۔

پتھر کھسک گیا

بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے بیان کیا۔ سننے والوں میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان میں سے تین آدمی ایک سفر پر نکلے۔ چلتے چلتے رات ہوگئی تو رات گزارنے کے لئے وہ ایک غار میں داخل ہو گئے۔ پہاڑوں پر اکثر پتھر گرنے (land slide) کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت اوپر سے ایک بڑا پتھر لڑھک کر گرا اور اس کی وجہ سے غار کا منھ بند ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ اس چٹان سے نجات کی ہمارے پاس اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں ہے کہ ہم اپنے نیک عمل کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کریں۔

اب ایک شخص دعا کرنے بیٹھا۔ اس نے کہا: خدایا، میرے باپ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ میرا معمول تھا کہ روزانہ شام کو جب میں اپنے جانور چرا کر لوٹتا تو جب تک میں ان دونوں کو دودھ نہ پلا لیتا نہ خود دودھ پیتا اور نہ کسی اور کو پلاتا۔ ایک دن میں چارہ کی تلاش میں دور نکل گیا۔ شام کو واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ میرے ماں باپ سو گئے۔ میں نے ان دونوں کے لئے دودھ نکال کر تیار کیا۔ جب ان کے پاس دودھ لے کر پہنچا تو دونوں کو سوتا ہوا پایا۔ مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ میں ان کو جگاؤں اور مجھ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ میں ان سے پہلے دودھ پیوں اور اپنے بچوں کو پلاؤں۔ میں ان کے پاس کھڑا ہوگیا۔ میرے ہاتھ میں پیالہ تھا اور میں اس انتظار میں تھا کہ جب وہ جاگیں تو میں ان کو دودھ پیش کردوں۔ اسی حال میں صبح ہوگئی۔ بچے میرے پاؤں کے پاس بلبلاتے رہے۔ صبح کو وہ دونوں اٹھے اور انھوں نے دودھ پیا۔ اس کے بعد ہم سب لوگوں نے دودھ پیا۔ میرے اللہ یہ عمل اگر میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس چٹان کی مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے۔ چنانچہ چٹان تھوڑی سی کھسک گئی مگر اتنی زیادہ نہیں کہ وہ تینوں نکل سکیں۔

اب دوسرے آدمی نے دعا شروع کی۔ اس نے کہا: خدایا، میرے چچا کی ایک لڑکی تھی۔ وہ مجھ کو بہت محبوب تھی، اس سے مجھ کو اسی قسم کی شدید محبت تھی جو مردوں کو عورتوں سے ہوتی ہے۔ میں نے اس سے اپنے نفس کی خواہش پوری کرنی چاہی مگر وہ منع کرتی رہی۔ کچھ عرصہ بعد وہ قحط سالی کی مصیبت میں پریشان ہوئی۔ وہ مدد کے لئے میرے پاس آئی۔ میں نے اس کو ۱۲۰ دینار اس شرط پر دئے کہ وہ مجھ کو اپنے اوپر قابو دے دے۔ وہ اس کے لئے تیار ہوگئی۔ یہاں تک کہ جب میں اس کے اوپر پوری طرح قادر ہوگیا اور اس کے دونوں پیروں کے درمیان بیٹھ گیا تو اس نے کہا: خدا سے ڈر اور مہر کو اس کے حق کے بغیر نہ توڑ۔ میں اس سے باز آگیا حالاں کہ وہ مجھ کو

تمام لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب تھی۔ اور جو دینار میں نے اس کو دئے تھے وہ بھی اس سے واپس نہیں لئے۔ خدایا، اگر میں نے یہ کام تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے جس میں ہم اس وقت پھنسے ہوئے ہیں۔ چنانچہ چٹان تھوڑی سی ہٹ گئی مگر اتنی نہیں کہ وہ نکل سکیں۔

اب تیسرے آدمی نے دعا کی۔ اس نے کہا۔ خدایا، میں نے کچھ مزدور اجرت پر رکھے۔ کام کے بعد میں نے سب کو اجرت دے دی۔ مگر ایک مزدور اپنی اجرت چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے اس کی چھوڑی ہوئی رقم کو کاروبار میں لگا دیا۔ اس سے مجھ کو بہت زیادہ مالی فائدہ ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وہ آدمی واپس آیا اور کہا: اے اللہ کے بندے، میری اجرت مجھ کو دے دے۔ میں نے اس سے کہا: یہ اونٹ، یہ گائیں، یہ بکریاں اور یہ غلام جو تم دیکھ رہے ہو یہ سب تمھاری مزدوری ہے۔ اس نے کہا: اے خدا کے بندے، مجھ سے مذاق نہ کر۔ میں نے کہا کہ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سب تمھارا ہی ہے۔ اس کے بعد اس نے سب چیزیں لیں اور ان کو اس طرح ہنکائے گیا کہ ان میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ خدایا، اگر یہ میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے۔ اس کے بعد چٹان ہٹ گئی اور وہ تینوں باہر نکل کر روانہ ہو گئے (بخاری و مسلم)

یہ روایت صحیحین میں آئی ہے اور اس کے واقعہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دعا ایسی چیز ہے جو پتھر کی چٹان کو بھی اپنی جگہ سے کھسکا دیتی ہے۔ مگر یہ وہ دعا نہیں ہے جو زبان سے بس الفاظ کی صورت میں نکلتی ہے اور آدمی کی حقیقی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ دعا سے چٹان کھسکنے کا واقعہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے تابع کر دیں، جو اپنے اوپر خدا کو نگراں بنا لیں۔ حتی کہ بھوک کی شدت اور بیوی بچوں کی محبت بھی ان کو خدا کی پسندیدہ راہ سے نہ ہٹا سکے۔ انتہائی نازک جذباتی مواقع پر بھی خدا کی یاد دلانا ان کو چونکا دینے کے لئے کافی ہو، ہیجان خیز لمحات میں بھی جب خدا کا نام لے لیا جائے تو ان کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں، اور ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ اپنی حرکت بند کر دیں۔ آخرت کے حساب کا اندیشہ ان پر اتنا زیادہ طاری ہو کہ ایک حق دار کا حق ادا کرنے کی خاطر اگر ان کو اپنا سارا اثاثہ دے دینا پڑے تو اس سے بھی وہ دریغ نہ کریں۔ ایک آدمی اگر اپنا مطالبہ لے کر ان کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ فوراً اس کو مان لیں خواہ مطالبہ کرنے والا کتنا ہی بے زور ہو اور اس کے مقابلہ میں ان کو کتنی ہی زیادہ قوت حاصل ہو۔

خدا کے بندے وہ ہیں جو اپنے نفس کو کچلنے اور اپنے فائدوں کو ذبح کرنے کی قیمت پر خدا کو اختیار کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اس طرح خدا کو اپنا لیں وہ اگر کہیں کہ خدایا تو اس پتھر کی چٹان کو کھسکا دے تو خدا پتھر کی چٹان کو بھی ان کے لئے کھسکا دیتا ہے۔

پیغمبر کا طریقہ

قَالَ مُسْلِمٍ فِی صَحِیحِہٖ حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِی عُمَر حَدَّثَنَا مَرْوَانُ الْفَزَارِیُّ عَنْ یَزِیدَ بْنِ کَیْسَانَ عَنْ ابْنِ أَبِی حَازِمٍ عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ۔ قِیلَ یَا رَسُولَ اللهِ ادْعُ عَلَی الْمُشْرِکِینَ قَالَ: إِنِّی لَمْ أُبْعَثْ لَعَّانًا وَإِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً۔

امام مسلم اپنی صحیح میں کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن ابی عمر نے کہا، ان سے مروان فزاری نے بیان کیا، ان سے یزید بن کیسان نے ان سے ابن ابی حازم نے اور ان سے ابو ہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ آپ مشرکوں کے خلاف بد دعا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ مجھ کو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کے اصحاب پر ان کے دشمنوں نے جو مصیبتیں ڈالیں اور جو ظلم کیا وہ آج کے ظلم اور مصیبت سے بہت زیادہ تھا۔ حتیٰ کہ مقدس صحابہ ان مظالم کو دیکھ کر کہہ اٹھے کہ ان کے خلاف بد دعا کی جائے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذہن کی تصحیح کی۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارا کام دنیا کو خدا کی رحمتوں کے سایہ میں داخل کرنا ہے نہ کہ ان کی ہلاکت اور بربادی کا سامان کرنا۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ آپ کے خلاف لوگوں نے ظلم کیا، اس کے باوجود آپ نے ان کے ساتھ خیر خواہی کی۔ لوگوں نے آپ پر مصیبتیں ڈالیں، اس کے باوجود آپ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی اعلیٰ سلوک کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ کو دنیا میں اعلیٰ ترین کامیابی حاصل ہوئی۔ قومیں آپ کے آگے جھک گئیں۔ ظلم اور سرکشی کرنے والے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ کے ساتھی اور معاون بن گئے۔

مسلمانوں کو بھی اپنے پیغمبر کے اسی نمونہ پر عمل کرنا ہے۔ ہم کو اقوام عالم کا خیر خواہ بننا ہے، خواہ بظاہر وہ ہمارے ساتھ بدخواہی کریں۔ ہمیں لوگوں کے حق میں ہدایت کی دعا کرنا ہے، خواہ وہ ہمارے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ کریں۔ ہمیں دوسروں سے محبت کرنا ہے، خواہ ہمیں دوسروں کی طرف سے نفرت و عداوت کا تجربہ ہو رہا ہو۔

یہی پیغمبر کا طریقہ ہے، اور پیغمبر کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد ہی مسلمان خدا کی ان نصرتوں کے مستحق قرار پا سکتے ہیں جن کا وعدہ خدا نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ ان کے لیے کیا ہے۔

رات کا آنا آج کے لحاظ سے اندھیرے کا آنا معلوم ہوتا ہے۔
مگر کل کے لحاظ سے وہ روشن صبح کے آنے کی تمہید ہے۔
خزاں کا موسم بظاہر پت جھڑ کا موسم نظر آتا ہے، مگر مستقبل
کے اعتبار سے وہ بہار کے سرسبز موسم کی خبر دے رہا ہے۔
یہ قدرت کا اٹل قانون ہے، مادی دنیا کے لیے بھی، اور
اسی طرح انسانوں کی دنیا کے لیے بھی ـــــ زیر نظر کتاب
میں اسی نقطۂ نظر سے موجودہ حالات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔